حوالات میں طلاق

جرم وسراغ رسانی اور جذبات کو ہلا دینے والی لاطویل سچی کہانیاں
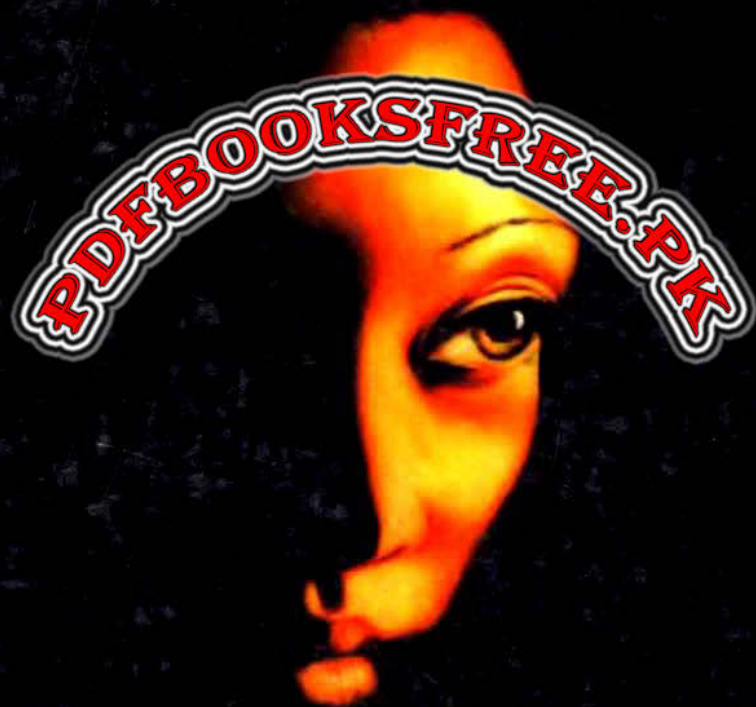
محبوب عالم

فہرست

پیش لفظ

محترم محبوب عالم کی تفتیشی اور سراغرسانی کی سچّی کہانیوں کے اس مجموعے میں دو طویل کہانیاں شامل کی گئی ہیں۔

کہانیاں تو طویل ہیں لیکن ان میں دلچسپیاں، سنسنی، سسپنس، دل و جگر کو ہلا دینے والے واقعات اور ولولہ انگیزی اتنی زیادہ ہے کہ آپ بے ساختہ کہہ اٹھیں گے کہ یہ تو بڑی ہی مختصر کہانیاں ہیں۔ ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ آپ نے کوئی ایک کہانی پڑھنی شروع کر دی تو دوسری مصروفیات بھول کر کہانی پوری پڑھ کے ہی اٹھیں گے۔

ہمارے جو قارئین آج کی پولیس کی کارگزاری اور کارستانیاں دیکھ رہے ہیں، وہ اگر ان کہانیوں کو من گھڑت قصّے یا افسانے سمجھتے ہیں تو حق بجانب ہیں کیونکہ انہوں نے انگریزوں کا دَورِ حکومت نہیں دیکھا۔ انگریز قانون شکنی برداشت نہیں کرتا تھا۔ تھانیداروں کی ترقی اور تنزّلی کا دارومدار قتل اور ڈکیتی کی وارداتوں تفتیش پر تھا اس لئے تھانیدار تفتیش اور سراغرسانی میں جانیں لڑا دیا کرتے تھے۔

ملزموں پر پردہ ڈالنے کے لئے کسی وزیر، کسی ایم این اے یا ایم پی اے کا، کسی بڑے افسر اور کسی بڑے جاگیردار کا اثر و رسوخ نہیں چلتا تھا، رشوت اور مُک مکا کی کوئی تھانیدار جرأت نہیں کرتا تھا۔ بالائی افسر تھانیداروں کے

اعصاب پر سوار رہتے تھے۔ ایک ہی حکم تھا' واردات ہوگئی ہے تو ملزم پکڑو اور دو چار دنوں میں پکڑو اور استغاثہ ایسا مضبوط بناؤ کہ ملزم بری نہ ہو سکے۔

ان حالات میں تھانیداروں کو سراغرسانی کے کمالات دکھانے پڑتے تھے۔

محترم محبوب عالم اُسی دَور کے پولیس انسپکٹر ہیں اور وہ اُن پولیس انسپکٹروں میں سے ہیں جو معجزے دکھایا کرتے تھے۔ ان کی تفتیشی کہانیوں کے پہلے مجموعے آپ نے پڑھے ہوں گے اور آپ یقیناً" ان کی سراغرسانی کے معترف ہوں گے۔ اب ان کی یہ دو طویل کہانیاں پڑھیں اور ان کی سراغرسانی کا عروج دیکھیں۔

عنایت اللہ

مدیر ماہنامہ "حکایت"

لاہور

حوالات میں طلاق

پولیس سروس میں چھوٹی بڑی سینکڑوں وارداتوں کی تفتیش کی ہے۔ تفتیش کسی بھی واردات کی آسان نہیں ہوتی۔ سب سے زیادہ مشکل تفتیش چوری اور ڈکیتی کی ہوتی ہے لیکن یہ واردات جو تحریر کر رہا ہوں' اس کی تفتیش نے تو مجھ کو زندگی سے بیزار کر دیا تھا۔ مجھ کو سراغرسانی کا مطلب سمجھ میں آگیا تھا۔ میری کھوپڑی میں اتنا دماغ نہیں تھا جتنا اس تفتیش نے کھالیا تھا۔

دن کے ساڑھے بارہ اور ایک بجے کے درمیان تقریباً" پچپن سال کی عمر کا ایک آدمی ایک جوان آدمی کے ساتھ تھانے آیا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ قصبے کے ساتھ کے ایک گاؤں سے آئے ہیں۔ انہوں نے گاؤں کا نام بتایا اور یہ بھی بتایا کہ وہ باپ بیٹا ہیں اور ایک معصوم بچے کے قتل کا پرچہ درج کرانے آئے ہیں۔ بات باپ نے کی۔ اُس کے لباس اور اُس کی چال ڈھال سے ظاہر ہوتا تھا کہ بڑی ذات کا آدمی ہے اور اچھی پوزیشن والا ہے۔ میں وہ واردات بیان کرتا ہوں جو اُس نے مجھ کو سنائی تھی۔

اس کی بیٹی قصبے میں بیاہی ہوئی تھی۔ دیہات کے لوگ قصبے کو شہر کہتے تھے اس واسطے میں بھی اس جگہ کو شہر کہوں گا۔ بیٹی کو بیاہے ہوئے تقریباً" ڈیڑھ سال گزر گیا تھا اور اس بیٹی کا پہلا بچّہ پیدا ہُوا تھا۔ یہ بچّہ سات یا شاید آٹھ مہینے کا ہوگیا تھا۔ اس شخص کا یعنی بچّے کے نانا کا گاؤں شہر سے دور نہیں تھا۔ فاصلہ

پورا ڈیڑھ میل نہیں تھا۔

اُس کی بیٹی کے سسرال کی طرف سے ایک آدمی اُس کو یہ اطلاع دینے گیا کہ اُس کی بیٹی کا بچّہ مرگیا ہے۔ نانا کو اور اس کے گھر والوں کو اس اطلاع پر اس واسطے اعتبار نہیں آیا کہ کوئی بچے کو بیماری نہیں تھی اور ایک ہی روز پہلے بچّے کا ماموں جو اپنے باپ کے ساتھ میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا' شہر اپنی بہن کو ملنے کے واسطے گیا تھا۔ بچّہ بالکل ٹھیک تھا۔

یہ لوگ تعجب اور غم کی حالت میں اپنی بیٹی کے گھر پہنچے۔ وہاں سارا محلّہ اکٹھا ہو گیا تھا۔ نانا' نانی اور ماموں نے پوچھا کہ بچّہ کس طرح مرا ہے؟ بچے کی ماں شاہدہ نے بتایا کہ کوئی ظاہری وجہ نہیں تھی۔ بچّہ ماں کا دودھ پی کر سو گیا تھا۔ اس وقت بچّہ تھوڑی دیر کے واسطے سویا کرتا تھا۔ شاہدہ نے بچّے کے جاگنے کے وقت اس کو دیکھا۔ وہ سویا ہُوا تھا۔ کچھ دیر بعد ماں نے پھر دیکھا تو بچّے کو مُردہ پایا۔ بچے کی ماں نے روتے پیٹتے ہوئے چلّانا شروع کر دیا کہ بچّے کو مارا گیا ہے۔

"باقی بیان دینے سے پہلے مجھ کو یہ بتائیں" ــــ میں نے بچّے کے نانا کو کہا ــــ "بچّے کا باپ کہاں ہے؟"

"وہ ہمارے ساتھ نہیں آیا"۔

"عجیب بات ہے" ــــ میں نے کہا ــــ "جس کا بچّہ ہے وہ نہیں آیا!"

"اس نے ہماری بات نہیں مانی!" ــــ نانا نے کہا ــــ "ہم نے کہا کہ بچّہ اگر بالکل ٹھیک تھا' ٹھیک صحت میں سویا تھا تو مر کیسے گیا؟ .... اُس نے غصے سے کہا کہ تم لوگوں کو شاید یہ شک ہے کہ اپنے بچّے کو میں نے مارا ہے یا تم کو یہ شُبہ ہے کہ باہر کا کوئی آدمی اندر آکر بچے کو مار گیا ہے"۔

"اب اپنا شبہ بتاؤ" ــــ میں نے کہا ــــ "بچے کے باپ کو کوئی شُبہ نہیں اور آپ کو ہے .... یہ بھی بتاؤ کہ یہ شبہ کیوں ہے؟"

"حضور والا!" ــــ بچّے کے نانا نے کہا ــــ "میری بیٹی لہراسب (بچے کا باپ) کی دوسری بیوی ہے۔ پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہیں تھی۔ لہراسب نے پانچ سال انتظار کیا۔ آخر اس نے دوسری شادی کرلی۔ میں نے اس کو اپنی بیٹی کا رشتہ دیا۔ ایک سال بعد میری بیٹی سے اس کا پہلا بچّہ پیدا ہُوا"۔

"کیا پہلی بیوی کو اس نے طلاق دے دی ہے؟" ــــ میں نے پوچھا۔

"نہیں حضور!" ــــ اُس نے جواب دیا ــــ "طلاق نہیں دی تھی۔ وہ لہراسب اور میری بیٹی کے ساتھ رہی لیکن بچّہ پیدا ہونے کے ایک دو مہینے بعد وہ لہراسب کے ساتھ لڑ جھگڑ کر چلی گئی۔ ہمیں یہ شک ہے کہ اس عورت نے میری بیٹی کے بچے کو مروا دیا ہے۔ اگر اس نے نہیں مروایا تو اس کے باپ یا ماں نے یا اس کے بھائیوں نے مروایا ہے۔ وہ لوگ ہماری ذات کے ہیں اور بڑی اونچی حیثیت والے ہیں۔ روپے پیسے والے بھی ہیں .... آپ سے ہماری درخواست ہے کہ بچے کی لاش کو قبضے میں لے کر پوسٹمارٹم کرائیں۔ ہمارے شبہے شکوک غلط ہو سکتے ہیں لیکن ہماری تسلّی پوسٹمارٹم سے ہی ہو سکتی ہے"۔

اُس نے اور اُس کے بیٹے نے ان باتوں کے علاوہ ایسی ٹھوس باتیں کیں کہ میں نے ضروری سمجھا کہ لاش کا پوسٹمارٹم ہونا چاہیے۔ میں نے بھی اور میرے محترم استاد احمد یار خان صاحب نے بھی کئی بار لکھا ہے کہ وہ انگریزوں کی حکومت کا زمانہ تھا۔ انگریز اپنے قانون کا پورا پورا احترام کرتے تھے۔ کسی تھانیدار کو جرأت نہیں ہوتی تھی کہ وہ معمولی سی واردات سے بھی نظریں پھیر لیتا۔ آج کل پتھر اور لکڑ ہی ہضم نہیں ہوتے بلکہ پورے خاندان کا خون بھی ہضم ہو جاتا ہے۔

میں متوّفی بچے کے نانا اور ماموں کو چکر دے سکتا تھا کہ بچے کے باپ کو لے آؤ' بچے کی ماں کو لے آؤ وغیرہ' لیکن فرض کا معاملہ زیادہ سخت تھا۔ میں

نے رسمی طور پر کاغذی کارروائی کی اور ایک ہیڈ کانسٹیبل اور دو کانسٹیبلوں کو ساتھ لے کر موقعہ پر پہنچ گیا۔

سوکن اور نُورانی شاہ

مکان اتنا اچھا تھا کہ اس سے مکان کے مالک کی حیثیت کا اندازہ ہو جاتا تھا۔ باہر محلّے کے آدمی گلی میں بچھی ہوئی دری پر بیٹھے ہوئے تھے۔ تھانیدار کو دیکھ کر سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے ان کو یہ کہہ کر بیٹھنے کو کہا کہ آپ لوگ ماتم میں بیٹھے ہیں' میرے لیے اُٹھ کر مجھ کو شرمسار نہ کریں۔

متوفی بچے کا باپ میرے پاس آگیا۔ وہ تیس سال سے کچھ کم عمر کا خوبرو اور ظاہری طور پر پُروقار آدمی تھا۔ اُس کے سُسر یعنی بچے کے نانا نے اُس کا تعارف میرے ساتھ کرایا۔ مجھ کو شک تھا کہ نانا اپنے داماد سے ناراض ہو گا کیونکہ داماد نے یہ بات نہیں مانی تھی کہ بچّہ قدرتی موت نہیں مرا اور لاش کا پوسٹمارٹم ہونا چاہیے۔ پھر داماد اس کے ساتھ تھانے بھی نہیں گیا تھا' لیکن اس شخص نے بڑے پیار سے تعارف کرایا۔

" یہ ہے جی میرا داماد لہرا سب!" ــــ اُس کے سُسر نے کہا ــــ "بے چارے کو خدا نے چھ سال بعد بچّہ دیا تھا اور چھین بھی لیا۔ سیدھا آدمی ہے۔ دشمن اپنا وار کر گئے ہیں۔ یہ مانتا ہی نہیں"۔

میں لہرا سب کو الگ لے گیا اور اُس سے پوچھا کہ اُس کو اپنی بیوی' بیوی کے باپ اور بھائی کی طرح کیوں شک نہیں ہُوا کہ بچے کو مارا گیا ہے؟"

" یہ کہتے ہیں کہ بچہ بیمار نہیں تھا" ــــ اُس نے جواب دیا ــــ "میں مانتا ہوں لیکن دن کے وقت کون جرأت کر سکتا ہے کہ بچے کو گھر میں آکر مار جائے۔ مجھ کو ایک شک ہے جو میری بیوی نہیں مانتی۔ بچے پر کھیس دیا ہُوا تھا۔

یہ کھیس اُس کے منہ اور ناک پر آگیا ہو گا جس سے بچے کا سانس رُک گیا اور وہ مر گیا"۔

"کیا پہلی بیوی پر شک نہیں؟" ــــ میں نے پوچھا ــــ "اُس کا باپ ہے' بھائی ہیں .... تم نے ان پر ظلم کیا ہے۔ پانچ سال بعد ان کی لڑکی کی چھُٹی کرا دی ہے اور طلاق بھی نہیں دی۔ ان پر تمہیں شک ہونا چاہیئے"۔

"میں پہلی بیوی پر یا اس کے باپ وغیرہ پر شک کر سکتا ہوں" ــــ اُس نے کہا ــــ "لیکن میرے پاس کوئی ثبوت اور کوئی شہادت نہیں" ــــ وہ خاموش ہو گیا اور تھوڑی دیر سوچ کر اُس نے کہا ــــ "میں اپنے معصوم بچے کی چیرپھاڑ برداشت نہیں کر سکوں گا"۔

دراصل میرا دل بھی یہی کہتا تھا کہ یہ معاملہ ویسے ہی ختم ہو جائے لیکن یہ میں اپنی مرضی سے ختم نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے بچے کی ماں سے ملنا بھی ضروری سمجھا۔ ایک کمرے میں اُس کو میرے پاس لایا گیا۔ اُس کی جو حالت تھی وہ ہر کسی کو سمجھ میں آسکتی ہے۔ اُس کا پہلا بچّہ جو لڑکا تھا' سات مہینے کی عمر میں ہی مر گیا تھا۔ میرے پاس بیٹھی تو اس کے منہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔ اس حالت میں اُس کی زبان سے صحیح بات نکلوانا بہت مشکل تھا۔ وہ روتی تھی اور ایک ہی بات کہتی تھی کہ اُس کے بچے کو مارا گیا ہے۔

میں اُس سے پوچھتا تھا کہ اُس کو یہ شک کس طرح ہُوا ہے اور اس شک کا ثبوت کیا ہے۔ پہلی بات تو وہ یہ کہتی تھی کہ اس کا بچہ بالکل تندرست تھا اور بچّہ اُس کا دودھ پی کر سویا تھا۔ دوسری بات یہ کہ پہلی بیوی جس کا نام انوری تھا' اُس کی شادی کے بعد اس کے ساتھ رہی اور اس کا اس سوکن کے ساتھ سلوک بھی ٹھیک رہا لیکن بچّہ پیدا ہُوا تو انوری کا سلوک اور روّیہ بالکل بدل

گیا۔ یہ شائد حسد تھا۔

"مجھ کو وجہ معلوم نہیں" ـــــ بچے کی ماں نے جس کا نام شاہدہ تھا' کہا ـــــ "میرا بچّہ دو مہینوں کا ہُوا تو ایک روز انوری اور لہراسب میں کسی بات پر جھگڑا ہو گیا اور اس کے بعد انوری اپنے دو اٹیچی کیس اٹھا کر اپنے گھر چلی گئی۔ اس نے نوکر کو بھیج کر تانگہ منگوایا تھا۔ لہراسب کمرے میں ہی بیٹھا رہا تھا۔ میں نے انوری سے پوچھا کہ کیا ہُوا ہے اور کہاں جا رہی ہو ....

"وہ غصے میں تھی۔ مجھ کو اُس نے غصے میں کہا کہ تم رہو اس گھر میں' میں جا رہی ہوں۔ پھر اُس نے جاتے جاتے یہ کہا کہ اس شخص کے نصیب میں خدا نے بچہ لکھا ہی نہیں۔ یہ اس دنیا سے بے اولاد ہی جائے گا۔ میری بات پر آپ یقین کریں کہ اُس کی یہ بات مجھ کو لگی تو بہت بُری لیکن میں نے اپنے دل کو سمجھا لیا کہ بے چاری کی قسمت ہی ٹھیک نہیں۔ اگر اس کی اولاد نہیں ہوتی تو اس میں اس کا کیا قصور ہے .... میں نے اُس کو جانے سے نہیں روکا۔ روکنا تو خاوند کا کام تھا۔ خاوند نے بھی باہر آ کر اُس کو نہ روکا اور وہ چلی گئی"۔

"اور تم نے خدا کا شکر ادا کیا ہو گا کہ سوکن گئی" ـــــ میں نے کہا۔

"آپ جو چاہیں سمجھیں" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "یہ تو خدا جانتا ہے کہ میں نے کیا سوچا اور کیا کہا تھا۔ آپ میرے خاوند سے پوچھ سکتے ہیں۔ میں اُس کی بات سنا رہی ہوں۔ محلے کی کئی عورتیں گواہی دیں گی کہ انوری کہتی پھرتی رہی کہ لہراسب کی قسمت میں بچّہ لکھا ہی نہیں۔ اُس نے یہ بھی مشہور کر دیا کہ یہ بچّہ حلال کا ہے ہی نہیں۔ مطلب یہ کہ یہ بچّہ میرے خاوند کا نہیں ....

"یہ ایسا بہتان تھا جس کو میں برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ میں اس کے گھر چلی گئی اور اس کی ماں کو کہا کہ خالہ جی انوری کو سمجھائیں کہ یہ مجھ کو اس طرح بدنام نہ کرے۔ اگر خدا نے مجھ کو بچہ دے دیا ہے تو یہ میری قسمت ہے اور

اگر انوری کا بچہ نہیں ہُوا تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ ہم سوکنیں ہو کر بھی بہنوں کی طرح اکٹھی رہتی تھیں۔ معلوم نہیں اس کو اچانک کیا ہو گیا ہے۔ اس کی لڑائی لہراسب کے ساتھ ہوئی تھی۔ میرے ساتھ تو نہیں ہوئی تھی۔ میں تو اب بھی لہراسب کو کہتی ہوں کہ انوری کو لے آؤ لیکن وہ کہتا ہے کہ اس کو میں نے تو گھر سے نہیں نکالا۔ خود گئی ہے ....

"انوری کی ماں نے کچھ نہ کہا' انوری غصے میں آ گئی اور اُس نے واہی تباہی بکنی شروع کر دی۔ میری برداشت ٹوٹ گئی اور میں اُس سے زیادہ غصے میں بولنے لگی۔ میں نے اُس کو گالیاں بھی دیں۔ آپ خود سوچیں کہ وہ بار بار کہتی تھی کہ یہ بچہ لہراسب کا نہیں .... میں وہاں سے نکل رہی تھی تو مجھ کو انوری کی ماں کے یہ الفاظ سنائی دیے کہ اس چڑیل کو معلوم نہیں کہ جس بچے پر اس کو اتنا ناز ہے وہ خدا واپس بھی لے لے گا ....

"پھر میرے کانوں میں یہ بات پڑی کہ انوری اور اس کی ماں نورانی شاہ کے پاس جاتی ہیں۔ آپ کو شاید پتہ ہو گا کہ ریلوے سٹیشن کے ساتھ پھاٹک سے ذرا آگے محلّے میں ایک عامل رہتا ہے .... نُورانی شاہ .... مجھ کو ایک عورت نے بتایا کہ یہ ماں بیٹی تمہارے گھر کو تباہ کرنے کے واسطے نورانی شاہ کے پاس جاتی ہیں۔ میں نے بھید لینے کی بہت کوشش کی ہے لیکن پتہ نہیں لگا کہ وہ وہاں کیوں جاتی ہیں"۔

میں نے اُس سے کچھ سوال پوچھے اور جرح کی۔ وہ اب میرے اوپر زور دے رہی تھی کہ میں ان سب کو گرفتار کروں۔ اُدھر بچے کے نانا اور ماموں نے بچے کے باپ لہراسب کو منوا لیا تھا کہ بچے کا پوسٹمارٹم ہونا چاہئے۔ میں نے اُن کو کہا کہ عورتوں کو باہر نکال دیا جائے۔

جب عورتوں کا ہجوم باہر نکلا تو میں اندر گیا۔ بچے کی لاش صحن میں چارپائی

پر پڑی تھی۔ دیکھ کر میرے دل کو بہت تکلیف ہوئی۔ اتنا معصوم اور پھول جیسا بچہ گھروں کی سیاست کا اور حسد کا شکار ہو گیا تھا اور اس پھول جیسے جسم کی چیرپھاڑ ہونی تھی۔

میں نے سب سے پہلے بچے کی گردن دیکھی۔ گردن پر کوئی ایسا نشان نہیں تھا جس سے یہ ظاہر ہوتا کہ بچے کا گلا گھونٹا گیا ہے۔ پھر میں نے بچے کے سارے جسم کو دیکھا۔ کہیں کوئی چوٹ اور ضرب یا زخم نہیں تھا۔ اگر اس کو زہر دیا گیا ہوتا تو لاش کا رنگ نیلا ہو گیا ہوتا اور منہ سے جھاگ نکل رہی ہوتی۔ میں نے جسم سے کپڑے ہٹا کر ایک بار پھر اور زیادہ غور سے دیکھا۔ یہ اس واسطے دیکھا کہ ہو سکتا ہے بچے کو سانپ یا بچھو نے ڈس لیا ہو لیکن ایسا بھی کوئی نشان نظر نہ آیا۔ مجھ کو یہ خیال بھی آیا کہ سانپ یا بچھو کے ڈسنے سے بچہ چیختا چلاّتا اور روتا۔ اگر ایسا ہوتا تو ماں دوڑ کر بچے تک پہنچتی۔

مجھ کو بچے کی موت قدرتی معلوم ہوتی تھی لیکن ان لوگوں کی درخواست پر میں نے ان کو کہا کہ لاش ہسپتال لے چلیں۔ میں نے اس کارروائی کے ضروری کاغذات تیار کیے اور میں خود ہی لاش کے ساتھ چلا گیا۔ یہ سول ہسپتال تھا۔ اُس وقت سب ڈاکٹر اچھے ہوتے تھے جو اپنی ذمہ داریوں کا پورا خیال رکھتے تھے لیکن یہ ڈاکٹر جو اُن دنوں ہسپتال میں تعیناّت تھا وہ بہت ہی قابل تھا۔ میں نے اُس کو بتایا کہ اس بچے کی لاش کا پوسٹمارٹم کیوں کرایا جا رہا ہے۔ میں نے اُس کو یہ بھی بتایا کہ میں پوسٹمارٹم رپورٹ دیکھ کر تفتیش شروع کروں گا۔

ڈاکٹر نے اُسی وقت اپنی کارروائی کا آغاز کر دیا۔

ڈاکٹر نے راستہ دکھا دیا

اس بوڑھے ہندو ڈاکٹر نے بڑی محنت سے پوسٹمارٹم کیا اور رپورٹ تیار

کی۔ رات کے نو بج رہے تھے۔ میں چونکہ لاش کے ساتھ خود گیا اور ڈاکٹر سے ملا تھا اس واسطے اُس نے مجھ کو ہسپتال بلایا اور رپورٹ دکھائی۔ لاش وارثوں کے حوالے کر دی گئی تھی۔ ڈاکٹر نے مجھ کو کچھ سمجھانا تھا۔ یہ بات سنانے سے پہلے میں آج کل کی ایک بات آپ صاحبان کو بتانا مناسب خیال کرتا ہوں۔ انگریزوں کی حکومت میں پوسٹمارٹم کرنے والے ڈاکٹر لاش کا بال بال دیکھتے تھے اور ایسی رپورٹ لکھتے تھے کہ شک کی گنجائش نہیں چھوڑتے تھے۔ اس سے تفتیش کرنے والے کا کام آسان ہو جاتا تھا۔ ڈاکٹر پوسٹمارٹم فوراً" کرتے تھے مگر آجکل کے ڈاکٹر ایسا نہیں کرتے۔ اکثر ڈاکٹروں کا طریقہ یہ ہے کہ ہسپتال کے ملازم لاش کی چیرپھاڑ کرتے ہیں۔ ان کو معلوم ہوتا ہے کہ پوسٹمارٹم میں کیا کچھ کرتے ہیں۔ وہ بولتے جاتے ہیں، مثلاً" دماغ ٹھیک ہے جی! دل، تلی اور جگر ٹھیک ہے جی! وغیرہ اور ڈاکٹر دُور بیٹھا ہُوا لکھتا جاتا ہے۔ زخموں کی گہرائی اور لمبائی چوڑائی بھی ملازم ہی ناپتے ہیں۔ پھر آپ صاحبان خود خیال میں لا سکتے ہیں کہ اس طرح پوسٹمارٹم ہو تو کیسے کیسے گُھپلے ہو سکتے ہیں۔

اُس ہندو ڈاکٹر نے مجھ کو ہسپتال بلایا۔ رات کے نو بج گئے تھے۔ اُس نے ابھی کھانا نہیں کھایا تھا۔ یہ فرض کی ادائیگی کی جنونی کیفیت تھی۔

"محبوب صاحب!" — اُس نے کہا — "یہ تو بلاشک و شُبہ قتل کا کیس ہے .... بچے کا سانس گلا گھونٹ کر نہیں روکا گیا بلکہ بچے کے ناک اور منہ پر تکیہ یا کپڑا بہت سی تہیں کر کے رکھا اور دبایا گیا ہے"۔

ڈاکٹر نے مجھ کو اچھی طرح سمجھایا کہ قتل کا یہ طریقہ اختیار کیا جائے تو مقتول کے پھیپھڑوں اور سانس کی نالی میں اتنی صاف تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے جو فوراً" نظر آجاتی ہے۔ ڈاکٹر نے مجھ کو بڑی باریکیوں سے یہ سارا معاملہ سمجھایا۔ میں جب لاش کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس گیا تھا تو اس کو بتایا تھا کہ بچے کا باپ کہتا

ہے کہ بچہ پیٹھ کے بل سویا ہُوا تھا۔ شاید اس کے منہ اور ناک پر کھیس یا کوئی اور کپڑا آگیا تھا جس سے بچے کا سانس رُک گیا ہو گیا۔ ڈاکٹر نے پوسٹمارٹم کے بعد دوسری باتیں سمجھا کر کپڑا منہ پر آنے والا معاملہ بھی سمجھایا۔

"ایسا ہو سکتا ہے" ــــ ڈاکٹر نے کہا ــــ "لیکن یہ اس صورت میں ہوتا ہے کہ بچہ ایک دو مہینوں کا ہو۔ اس عمر میں بچّہ زیادہ ہِل جُل نہیں سکتا۔ سات آٹھ ماہ کی عمر میں بچہ اتنا ہوشیار ہو جاتا ہے کہ کپڑا منہ پر آجائے تو ہاتھوں سے ہٹا دیتا ہے، تڑپتا ہے، کروٹیں بدلتا ہے، روتا چلّاتا ہے اور اس کی ماں یا گھر کا کوئی اور فرد بچے کو دیکھنے کے واسطے پہنچ جاتا ہے .... یہ بھی سُن لیں۔ اگر چادر یا کھیس منہ اور ناک پر آجائے تو پھر بھی کچھ نہ کچھ ہوا پھیپھڑوں میں جاتی رہتی ہے"۔

"مجھ کو یہ بتائیں ڈاکٹر صاحب!" ــــ میں نے پوچھا ــــ "جس بستر پر بچّہ سویا ہُوا تھا اس بستر پر مجھ کو کیا دیکھنا چاہئے؟"

"یہ میں آپ کو بتانے ہی لگا تھا" ــــ ڈاکٹر نے کہا ــــ "لوگ اتنے چھوٹے بچوں کے واسطے چھوٹے چھوٹے تکئے اور گدّیاں سی بنا کر رکھتے ہیں۔ اگر اس بچے کے دائیں بائیں ایسے چھوٹے تکئے رکھے ہوئے تھے تو ان کو غور سے دیکھیں۔ اس طریقے سے سانس روکا جائے تو ناک اور منہ سے تھوک کا مواد نکلتا ہے جو زیادہ مقدار میں نہیں ہوتا۔ یہ اُس کپڑے یا تکئے یا گدّی پر لگ جاتا ہے۔ تکیہ بڑا بھی ہو سکتا ہے ....

"میں نے ایسا ایک کیس نئی دلّی میں دیکھا تھا۔ ایک اینگلو انڈین نے اپنی بیوی کو اُس کے منہ پر تکیہ رکھ کر اور اوپر سے دباؤ ڈال کر ہلاک کیا تھا۔ لاش کا پوسٹمارٹم میں نے کیا تھا۔ تفتیش کرنے والے سب انسپکٹر نے میرے بتانے پر تکیہ برآمد کیا تھا جس پر منہ اور ناک سے نکلا ہُوا کچھ مواد لگا تھا۔ اس سے

سراغ ملا تھا کہ اس تکئے سے اس کا سانس روکا گیا تھا۔ پھر قاتل چند اور کڑیاں مل جانے سے پکڑا گیا تھا ....

"محبوب صاحب! وقت ضائع نہ کریں۔ ابھی اُس گھر جا دھمکیں اور بچے کی ماں کو کہیں کہ بچے کے پلنگ پر جو تکئے اور کپڑے وغیرہ تھے وہ آپ کے حوالے کر دے۔ ان سب چیزوں کو گہری نظر سے دیکھیں۔ کسی بھی تکئے یا کپڑے پر ذرا سا بھی نشان ہو وہ میرے پاس لے آئیں۔ اس بچے کے منہ اور ناک میں سے آخری سانس ختم ہونے سے پہلے تھوڑا سا مواد نکلا تھا۔ میں نے اس کی لاش کے منہ اور ناک میں سے کچھ مواد نکال کر محفوظ کر لیا ہے۔ اگر آپ مطلوبہ کپڑا لے آئے تو میں یہ مواد جو میرے پاس ہے اور کپڑا جو آپ لائیں گے، لاہور بھیجوں گا۔ وہاں سے رپورٹ آئے گی کہ یہ دونوں مواد ایک ہی انسان کے منہ یا ناک میں سے نکلے ہیں"۔

میں نے ڈاکٹر کا شکریہ ادا کیا کہ اُس نے مجھ کو ایک صاف راستہ دکھا دیا تھا۔ میں اُٹھنے لگا تو اس ہندو ڈاکٹر نے ایک بات کہہ کر مجھ کو شرمسار کر دیا۔

"محبوب صاحب!" ــــ ڈاکٹر نے کہا ــــ "ناراض نہ ہونا۔ آپ کی قوم کے بارے میں ایک بات دل میں آگئی ہے .... میں مسلمانوں پر حیران ہوتا ہوں کہ یہ کیسی قوم ہے۔ بڑی عمر کے آدمی تو قتل ہوتے رہتے ہیں، دیکھو کتنے چھوٹے سے بچے کو بھی انہوں نے قتل کر دیا ہے۔ اصل وجہ کچھ بھی نہیں ہو گی۔ یہی کوئی چھوٹی موٹی سیاست ہو گی، جائیداد کی وراثت کا معاملہ ہو گا، اور اتنے پیارے بچے کو قتل کر دیا"۔

میں نے اُس کی اس بات کی تائید کی۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ ہندوؤں کے خلاف ساری باتیں کہی جا سکتی ہیں لیکن مسلمانوں میں قتل و غارت گری جو ہے

وہ ہندوؤں میں نہیں تھی۔ ڈکیتی اور رہزنی کی وارداتوں میں بھی مسلمان پیش پیش رہے ہیں۔

میں ہسپتال سے نکل کر تھانے گیا۔ رات کے دس بجے سے اوپر وقت ہو چکا تھا۔ ایک ہیڈ کانسٹیبل اور دو کانسٹیبلوں کو ساتھ لے کر میں لہراسب کے گھر چلا گیا۔

تکیئے کا راز

"ڈاکٹر نے کیا لکھا ہے؟" — بچے کے باپ لہراسب نے دوڑ کر میرے پاس آتے ہوئے پوچھا۔

"قتل!" — میں نے کہا — "بچے کو سانس روک کر مارا گیا ہے"۔

"ہمارا شک ٹھیک نکلا نا!" — بچے کے نانا نے کہا جو میرے قریب آچکا تھا۔

"بچے کا جنازہ کس وقت ہو گا؟" — میں نے پوچھا۔

"اب تو صبح ہی ہو گا" — لہراسب نے جواب دیا۔

"لہراسب بھائی!" — میں نے کہا — "مجھ کو اُس کمرے میں لے چلو جس میں بچّہ سویا ہُوا تھا.... اس کمرے میں میرے ساتھ بچے کی ماں کے سوا اور کسی کو نہیں ہونا چاہیئے"۔

لہراسب مجھ کو اندر لے گیا۔ بچے کی میّت برآمدے میں رکھی تھی اور محلّے کی بہت ساری عورتیں وہاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ لہراسب مجھ کو ایک کمرے میں لے گیا۔ کمرے میں دو پلنگ بچھے ہوئے تھے جو بہت اچھی قسم کے تھے۔ کمرے میں اور بھی فرنیچر اور اشیاء تھیں وہ سب قیمتی تھیں اور سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ لہراسب امیر آدمی ہے اور سلیقے والا بھی۔

لہراسب کمرے سے نکلا تو اس کی بیوی شاہدہ کمرے میں آ گئی۔ وہ نوجوان لڑکی تھی۔ لہراسب نے اس کے ساتھ اولاد کی خاطر شادی کی تھی۔

"تمہارا شک ٹھیک نکلا شاہدہ!" — میں نے اُس کو کہا — "بچے کو اس کا سانس روک کر قتل کیا گیا ہے"۔

"پھر اس ڈائن کو پکڑیں" — شاہدہ نے کہا — "اس نوری کو..."

"میں اب معلوم نہیں کس کس کو گرفتار کروں گا" — میں نے کہا — "تم یوں کرو کہ مجھ کو یہ بتاؤ بچہ کہاں سویا ہُوا تھا"۔

اُس نے ایک پلنگ کے درمیان ہاتھ رکھ کر بتایا کہ بچّہ یہاں سویا ہُوا تھا۔ پھر میں نے اُس کو کہا کہ بچے کے اوپر جو کمبل یا کھیس تھا اور سر کے نیچے جو تکیہ تھا اور دائیں بائیں اگر تکیے تھے تو وہ سب پلنگ پر رکھ دے۔

"وہ تو ساری چیزیں اسی طرح پلنگ پر پڑی ہوئی ہیں" — شاہدہ نے کہا — "بچے کو دیکھا کہ مرا پڑا ہے تو میں نے اسے اٹھا لیا اور چیخنا چلّانا شروع کر دیا۔ محلّے کی عورتیں اکٹھی ہو گئیں۔ ان میں سے کسی نے صحن میں چارپائی بچھائی' اور بچّہ مجھ سے لے کر چارپائی پر ڈال دیا۔ مجھ کو تو ہوش ہی نہیں تھی کہ پلنگ سے یہ چیزیں اٹھاتی"۔

وہ بولتی جا رہی تھی اور میں پلنگ پر پڑی ہوئی چیزیں دیکھ رہا تھا۔ چھوٹا سا ایک تکیہ پر جس پر بچے کا سر تھا' اس پر کوئی نشان نہیں تھا۔ اسی سائز کے چھوٹے چھوٹے دو اور تکیے تھے۔ یہ گول نہیں چوڑے تھے۔ ایک تکیہ اس طرح رکھا تھا کہ دیکھ کر ہی سمجھ آجاتی تھی کہ یہ بچے کے ساتھ رکھا گیا تھا۔ میں نے اس کو دونوں طرف سے دیکھا۔ کوئی نشان نہیں تھا۔

اسی سائز کا ایک تکیہ اور تھا جو دوسرے پہلو کے ساتھ رکھا ہونا چاہیئے تھا لیکن وہ خاصا پرے پڑا ہُوا تھا۔ میں نے یہ اٹھا کر دیکھا۔ اس کے نیچے والی سائیڈ

دیکھی تو اس کے بالکل وسط میں ایک ایسا نشان تھا جیسے یہاں دودھ کے چند قطرے گرے ہوں۔ نشان اُوٹ پٹانگ سا تھا۔ یعنی نہ گول نہ چوکور یہ ایک انچ مربع سے ذرا زیادہ ہی ہو گا۔ یہ خشک ہو چکا تھا اور اس جگہ کپڑا اکڑا ہُوا تھا۔ تینوں تکیوں کے غلاف لٹھے کے تھے اور ان کے کناروں پر پھول کاڑھے ہوئے تھے۔

میں نے غلاف اتارنے کی بجائے پورا تکیہ قبضے میں لے لیا پھر کھیس دیکھا۔ اس پر اس قسم کا کوئی نشان نہیں تھا۔

میں نے فیصلہ کیا کہ تفتیش صبح شروع کروں گا۔ شاہدہ اور لہراسب کو کچھ ضروری باتیں سمجھا کر میں باہر کو چل پڑا۔ میں نشان والا تکیہ اپنے ساتھ لے جا رہا تھا۔

"آپ یہ تکیہ ساتھ لے جا رہے ہیں؟" —— لہراسب نے پوچھا۔

"ہاں!" —— میں نے جواب دیا —— "تمہیں واپس مل جائے گا"۔

"اس میں کونسی خاص بات ہے؟"

"یہ دیکھنا میرا کام ہے لہراسب!" —— میں نے کہا —— "میں اب باقاعدہ تفتیش کر رہا ہوں۔ مجھ سے اب یہ نہ پوچھنا کہ میں یہ کیوں کر رہا ہوں اور وہ کیوں کر رہا ہوں"۔

اُس نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن اس کی زبان ہکلا گئی۔ میں سمجھ نہ سکا کہ وہ تکیے کو دیکھ کر کیوں گھبرا رہا تھا۔ میں وہاں سے نکل آیا اور اپنے گھر چلا گیا۔

دوسری بیوی کا دل کہیں اور تھا

تھانہ قصبے کے اندر تھا اور اس محلّے سے دُور بھی نہیں تھا' اس واسطے میں

نے موقعہ پر جا کر تفتیش کرنے کی بجائے تھانے میں ہی ہر کسی کو بلانا مناسب سمجھا۔ صبح سب سے پہلے میں نے نشان والا تکیہ اٹھایا اور ہسپتال چلا گیا۔ تکیہ ڈاکٹر کو دیا تو اُس نے نشان کو اپنی ناک کے ساتھ لگا کر سُونگھا۔

"یہ دودھ کا نشان نہیں" —— ڈاکٹر نے کہا —— "یہ وہی چیز ہے جو میں نے آپ کو بتائی تھی۔ یہ میں آج ہی دستی لاہور بھیج دوں گا۔ زیادہ سے زیادہ دو دنوں بعد رپورٹ آ جائے گی .... میں کہہ سکتا ہوں کہ بچے کا سانس اسی تکیے سے روکا گیا ہے"۔

پہلے بتا چکا ہوں کہ ڈاکٹر نے بچے کی لاش کے منہ اور ناک سے کچھ مواد نکال کر ٹسٹ ٹیوب میں محفوظ کر لیا تھا۔

ڈاکٹر کے ساتھ اس مسئلے پر کچھ دیر تبادلۂ خیالات ہُوا۔ یہ شخص' ڈاکٹر منوہر کپور بہت ہی مخلص آدمی تھا۔ اُس نے کہا' محبوب صاحب! ایسے پیارے اور اتنے معصوم بچے کے قاتل کو بچ کر نہیں جانا چاہئے .... میرے اپنے جذبات ایسے ہی تھے۔ ایک تو وہ بچہ تھا جو اپنا دفاع نہیں کر سکتا تھا' دوسرے یہ کہ وہ سویا ہُوا تھا۔ یہ درندگی تھی اور بُزدلی تھی۔

میں تھانے میں آیا۔ اپنے اعتماد کے ایک ہیڈ کانسٹیبل کو یہ بتا کر بھیجا کہ جنازہ ہو چکا ہو تو لہراسب اپنی بیوی کو ساتھ لے کر تھانے آ جائے یا جنازے سے فارغ ہو کر دونوں آ جائیں۔ پھر ہیڈ کانسٹیبل کو کہا کہ لہراسب کی پہلی بیوی انوری کو ساتھ لے آئے۔ ہیڈ کانسٹیبل کو میں نے خاص بات یہ کہی کہ لہراسب کے نوکر کو الگ کر کے کہے کہ وہ اپنے تمام کام کاج چھوڑ کر تھانے آ جائے۔

سب سے پہلے نوکر پہنچ گیا۔ لہراسب ابھی قبرستان سے واپس نہیں آیا تھا۔ میں نے نوکر کو اپنے پاس بٹھایا۔ ضروری نہیں تھا کہ نوکر ملزم ہی ہوتا' لیکن اس کلاس کے لوگ پولیس کے واسطے بڑے کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔ میں نے

پہلے تو نوکر کو نظروں سے پرکھا۔ اُس کے چہرے پر جو گھبراہٹ تھی وہ تو قدرتی بات تھی۔ مجھ کو وہ کوئی ایسا چالاک نہیں لگتا تھا۔ میں نے اُس کے مالکوں کے خلاف اور اُس کے حق میں کچھ باتیں کیں اور اپنا بولنے کا انداز دوستانہ رکھا تو اُس سے اس کی گھبراہٹ ختم ہو گئی۔

"تم پر کوئی الزام نہیں" — میں نے کہا — "کوئی شُبہ بھی نہیں تمہارا نام کیا ہے؟.... بس یہ خیال رکھنا کہ میں جو پوچھوں وہ بالکل سچ بتانا۔ اگر کوئی غلطی تم سے اس واردات کی بابت ہو چکی ہے تو وہ بھی بتا دینا۔یہ لوگ دولت کے نشے میں بڑی بڑی وارداتیں کرتے ہیں اور جب پکڑے جاتے ہیں تو نوکروں چاکروں کو آگے کر دیتے ہیں۔ میں ان لوگوں کا دشمن ہوں۔ تم نے کوئی فکر نہیں کرنا۔ تم میری مدد کرتے رہنا' میں تمہاری مدد کروں گا.... تم کب سے ان کے پاس ہو؟"

"میرا نام شرف دین ہے جناب!" — اس ادھیڑ عمر نوکر نے کہا — "ویسے میں شرفو کہلاتا ہوں۔ آپ کے آگے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ آپ کو اپنا مائی باپ سمجھوں گا۔ بس جناب' میرے اوپر یہ مہربانی کرنا کہ میرے منہ سے چوہدری لہراسب یا ان کے گھر والوں کے بارے میں کوئی ایسی ویسی بات نکل جائے تو یہ اپنے تک ہی رکھنا۔ اُن کو پتہ نہ لگے"۔

میں نے اس کو تسلّی دی کہ وہ نڈر ہو کر ہر بات کرے۔ اُس نے بتایا کہ وہ پندرہ سولہ سال کی عمر میں اس گھر میں آیا تھا اور اب اس کی عمر چالیس سال ہو گئی تھی۔ لہراسب کے باپ دادا کی اُس نے بہت تعریف کی اور کہا کہ یہ خاندان نوکروں اور مزارعوں کی عزت آبرو اور ہر ضرورت کا بہت خیال رکھتا ہے۔ لہراسب کی شرافت اور اُس کے کردار کی تو اس نے بہت ہی تعریف کی۔ کہتا تھا کہ لہراسب اپنے اصول' زبان اور ایمان کا بہت پکّا ہے اور غریب کی پرورش

کرتا ہے۔

میں نے اُس کو کہا کہ یہ بتائے کہ انوری کے ساتھ لہراسب کی شادی ہوئی تھی تو وہ دونوں کس طرح رہتے تھے اور پھر دوسری شادی ہوئی تو کیا ہُوا' اور میں نے اس کو یہ بھی کہا کہ انوری اور شاہدہ کی بابت جو وہ جانتا ہے بتا دے۔

اُس نے جو لمبا چوڑا حال احوال بیان کیا وہ مختصر لفظوں میں اس طرح ہے کہ انوری کا خاندان بڑا شریف اور وقار والا خاندان تھا۔ بڑے اچھے طریقے سے شادی ہوئی تھی۔ انوری اس گھر میں آئی تو لہراسب کے باپ نے ان کو یہ حویلی دے دی کہ یہ اپنی آزاد زندگی گزاریں۔ یہ دونوں بڑے پیار اور محبت سے دن گزارتے رہے۔ تیسرے چوتھے سال تک ان کا بچّی بچّہ نہ ہُوا تو دونوں نے پیروں' فقیروں کے پاس جانا شروع کر دیا۔ دو تین مرتبہ انوری نے کہا کہ شرفو' دعا کرو کہ اللہ مجھ کو بچّہ دے۔

"میں یہی بتا سکتا ہوں جناب!" — اُس نے کہا — "میں یہ نہیں بتا سکتا کہ اندر خانے کیا ہوتا رہا۔ بی بی انوری اُداس اُداس رہنے لگی تھی۔ وہ پانچوں وقت نماز پڑھتی تھی اور خیر خیرات بھی کرتی تھی۔ آخر ایک روز میرے کانوں میں یہ بات پڑی کہ چوہدری لہراسب دوسری شادی کر رہے ہیں۔ پھر ایک دن دوسری بیوی آگئی اور پھر آپس میں پہلے کی طرح بسنے رہنے لگے"۔

"اب یہ بتاؤ شرفو!" — میں نے پوچھا — "انوری نے تو سوکن کو گھر میں دیکھ کر بہت بُرا سمجھا ہو گا!"

"نہیں جناب!" — اُس نے کہا — "میں حیران ہُوا کہ بی بی انوری نے ذرا سا بھی بُرا منہ نہیں بنایا بلکہ بی بی شاہدہ کو اس طرح قبول کر لیا جیسے بی بی انوری چوہدری لہراسب کی ماں ہو اور بی بی شاہدہ اس کی بہو۔ پھر دونوں ٹھیک ٹھاک رہتی رہیں۔ دونوں میں کبھی اونچی بات نہیں ہوئی تھی' لیکن بی بی شاہدہ کا

بچّہ ہُوا تو میں نے دیکھا کہ بی بی انوری کچھ اُداس اُداس رہنے لگی تھی۔ تین چار مہینے بعد میں گھر میں اپنے کام کاج میں لگا ہوا تھا تو چوہدری لہراسب اور بی بی انوری کی اونچی اونچی باتیں سنائی دینے لگیں۔ بی بی شاہدہ دوسرے کمرے میں تھی۔ شاید وہ بھی سُن رہی تھی۔ پھر ایسا ہُوا کہ بی بی انوری کمرے سے باہر آئی اور مجھ کو کہا کہ تانگہ لے آؤ۔ میں دوڑا گیا اور گلی میں تانگہ لے آیا۔ بی بی انوری نے دو اٹیچی کیس نکال کر رکھے ہوئے تھے۔ وہ میں نے تانگے میں رکھے اور بی بی چلی گئی۔ جناب! میں نے اس بات پر بھی غور کیا ہے کہ چوہدری لہراسب کمرے میں ہی بیٹھے رہے اور جب میں اندر آیا تو اُس وقت بی بی شاہدہ چوہدری لہراسب کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھ کو بالکل معلوم نہیں کہ ان کے درمیان کیا باتیں ہو رہی تھیں"۔

"کیا اس کے بعد انوری کے گھر سے کوئی چوہدری لہراسب کے پاس آیا تھا؟" ــــ میں نے پوچھا۔

"نہیں جناب!" ــــ شرفو نے جواب دیا ــــ "اُدھر سے کوئی بھی نہیں آیا اور اگر چوہدری صاحب اُدھر گئے ہوں تو وہ مجھ کو پتہ نہیں"۔

"اب یہ بتاؤ شرفو!" ــــ میں نے پوچھا ــــ "انوری اور شاہدہ میں سے تم کو کون سی اچھی لگتی تھی یا تم ان دونوں میں سے کس کو اچھا سمجھتے تھے؟"

"جنابِ عالی!" ــــ شرفو نے ہاتھ جوڑ کر کہا ــــ "میری اور میرے بچوں کی روزی کا خیال رکھنا۔ میں بات سچّی کروں گا۔ اچھی انوری بی بی تھی۔ یہ نہیں کہ مجھ کو اچھی لگتی تھی۔ بات یہ ہے جناب! وہ ہر کسی کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتی تھی اور سب اس کو اچھا کہتے تھے۔ یہ بھی سوچیں جناب کہ اس بی بی نے اپنی سوکن کے ساتھ بھی اچھا برتاؤ رکھا.... اچھی تو شاہدہ بی بی بھی ہے لیکن دونوں بی بیوں میں بڑا فرق ہے۔ بی بی انوری اس گھر میں رہتی تھی تو پتہ لگتا تھا

کہ اس کا دل اسی گھر میں لگا ہُوا ہے اور وہ شاید اسی گھر میں پیدا ہوئی ہے' لیکن بی بی شاہدہ کا طریقہ کچھ ایسا ہے جیسے اُس کا دل پوری طرح اس گھر میں نہیں ہے۔ چوہدری لہراسب کے ساتھ بی بی انوری کی محبت ایسی تھی کہ صاف پتہ لگتا تھا کہ اس بی بی کا دل چوہدری کے ساتھ ہے۔ بی بی شاہدہ بھی چوہدری لہراسب کے ساتھ اسی طرح بلکہ اس سے تھوڑا زیادہ پیار محبت کرتی تھی' لیکن مجھ کو ایسا شک ہوتا تھا جیسے یہ لڑکی شو مار رہی ہے اور اس کا پیار دکھاوے والا ہے....

"پھر میں نے ان دونوں میں یہ فرق دیکھا کہ بی بی انوری اسی شہر کی رہنے والی تھی لیکن اپنے ماں باپ کے گھر مہینے میں ایک یا دو مرتبہ جاتی تھی اور شام کو واپس آجاتی تھی۔ بی بی شاہدہ ڈیڑھ ایک میل دُور کے گاؤں کی رہنے والی ہے اور وہ مہینے میں کم از کم چار مرتبہ اپنے ماں باپ کے پاس جاتی ہے اور ایک دن ایک رات گزار کر آتی ہے۔ شہر کے ایک محلّے میں بی بی شاہدہ کے کوئی رشتہ دار یا ملنے جُلنے والے رہتے ہیں۔ تیسرے چوتھے روز بی بی اُن کے گھر چلی جاتی تھی۔ ان لوگوں کا ایک جوان لڑکا چوہدری لہراسب کا دوست بن گیا۔ بی بی شاہدہ کی شادی سے پہلے چوہدری اور اس لڑکے کا کوئی میل ملاقات نہیں تھا۔ اس جوان آدمی کا نام آصف ہے۔ یہ شخص چوہدری لہراسب کی غیر حاضری میں کبھی کبھی آجاتا ہے۔ سچّی بات یہ ہے کہ جناب! میں نے جو شرافت اور اخلاق بی بی انوری میں دیکھا تھا وہ بی بی شاہدہ میں نہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ بی بی شاہدہ بدمعاش عورت ہے۔ میں یہ کہتا ہوں کہ دونوں بی بیوں میں یہ فرق ہے"۔

اس نوکر نے میری حوصلہ افزائی اور اپنی شرافت کی وجہ سے بڑی صاف باتیں شروع کر دی تھیں۔ میں یہ دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ شخص انوری

کا منظورِ نظر ہو گا اور وہ اس کو کھلاتی پلاتی رہتی ہو گی اور اب انوری نے اس کو بچّے کے قتل میں استعمال کیا ہو گا۔ میں نے یہ شبہ دماغ میں رکھ کر اُس سے باتیں پوچھنی شروع کر دیں۔

کیا بچّہ اپنے باپ کا نہیں تھا؟

"تم ٹھیک کہتے ہو شرفو!" —— میں نے ویسے ہی کہہ دیا —— "سب لوگ انوری کی تعریف کرتے ہیں۔ کسی نے مجھ کو بتایا کہ وہ تم کو تنخواہ کے علاوہ بھی پیسے دیتی رہتی تھی اور تمہارے بیوی بچوں کا بھی بہت خیال رکھتی تھی"۔

"نہیں جناب!" —— وہ درمیان میں ہی بول پڑا —— "اُس نے مجھ کو کبھی فالتو پیسہ نہیں دیا تھا نہ اس نے کبھی مجھ پر کوئی فالتو مہربانی کی تھی۔ مجھ کو تنخواہ اور کپڑے وغیرہ چوہدری صاحب دیتے تھے۔ میرے بیوی بچّوں کے ساتھ بی بی انوری کا ایسا کوئی تعلق نہیں تھا۔ آپ جو بات معلوم کرنا چاہتے ہیں وہ بی بی شاہدہ کی بابت صحیح ہے۔ یہ بی بی مجھ کو کبھی کبھی الگ پیسے دیتی ہے اور ویسے بھی مجھ کو بہت اچھا چاہتی ہے۔ میں نے آپ کو بتایا ہے کہ کبھی کبھی چوہدری آصف آتا اور آتے ہی چوہدری صاحب کا پوچھتا ہے۔ اُس کو پتہ لگے کہ چوہدری صاحب گھر نہیں ہیں تو وہ بی بی شاہدہ کے پاس بیٹھ جاتا ہے۔ بہت دیر کمرے میں بیٹھ کر وہ چلا جاتا تو اُس روز بی بی شاہدہ مجھ کو ضرور ہی کچھ پیسے دیتی اور کہتی ہے کہ بچّوں کے واسطے کوئی کھانے پینے کی چیز لے جانا۔ ایک بار چوہدری آصف نے بھی جاتے ہوئے مجھ کو دو روپے دیے تھے....

"ایک بات اور میں نے دیکھی کہ بی بی شاہدہ نے مجھ کو تین چار مرتبہ کہا کہ چوہدری صاحب کو نہ بتانا کہ ان کی غیر حاضری میں آصف آیا تھا۔ پھر بی بی نے ساتھ یہ بھی کہا کہ آصف چوہدری صاحب کو ہی ملنے کے واسطے آتا ہے'

لیکن ہو سکتا ہے کہ چوہدری صاحب اچھا نہ سمجھیں کہ آصف میرے پاس بیٹھ جاتا ہے.... جنابِ عالی! مجھ کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ میں چوہدری صاحب کو بتاتا۔ میں نے نوکری چاکری کرنی ہے وہ کر رہا ہوں"۔

یہ تو ایک موٹی سی بات تھی جو میں نے سنا دی ہے۔ چھوٹی چھوٹی کئی باتیں تھیں جو میں نے شرفو سے پوچھی تھیں۔ کچھ انوری کی بابت تھیں اور کچھ شاہدہ کی بابت۔ اس واردات تک میں بے شمار وارداتوں کی تفتیش کر چکا تھا۔ سینکڑوں آدمی، مرد بھی عورتیں بھی، بچّے بوڑھے بھی، میرے سامنے آئے تھے اور مجھ کو اتنا تجربہ ہو گیا تھا کہ چہرہ دیکھ کر اور تھوڑی سی باتیں سن کر میں یقین کے ساتھ کہہ دیتا تھا کہ اس شخص کا اس واردات کے ساتھ کوئی تعلق ہے یا نہیں اور اگر ہے تو کتنا کچھ ہے۔ شرفو کا تو یہ حال ہو گیا تھا کہ وہ پوری طرح میری مُٹھی میں آگیا تھا اور میرے اشارے پر اُس کے منہ سے باتیں نکل رہی تھیں۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ یہ شخص انوری کا نہیں بلکہ شاہدہ کا منظورِ نظر اور رازدار بھی تھا۔ ہو سکتا تھا کہ اپنے درپردہ رول پر پردہ ڈال رہا ہو، لیکن یہ اتنا چالاک معلوم نہیں ہوتا تھا۔ میرا شُبہ تو یہ تھا کہ انوری نے بچّے کو مروانے کے واسطے اس نوکر کو استعمال کیا ہو گا۔ یہ شُبہ صحیح یا غلط ثابت کرنے کے واسطے میرے پاس اور بھی ذریعے موجود تھے۔

"اب یہ بتاؤ شرفو!" —— میں نے کہا —— "کل جب بچّہ کمرے میں سویا ہُوا تھا اُس وقت تم کہاں تھے اور گھر میں کون کون تھا؟"

"ایک چھت پر لپائی کرنی تھی" —— اُس نے جواب دیا —— "آپ نے دیکھا ہے کہ حویلی کا صحن کتنا چوڑا ہے۔ میں ایک کونے میں لپائی کے لئے گارہ تیار کر رہا تھا۔ دائی آئی ہوئی تھی اور بی بی شاہدہ کے پاس برآمدے میں بیٹھ گئی

تھی۔ دائی کچھ دیر بعد گئی تھی"۔

"ذرا اور یاد کرنے کی کوشش کرو شرفو!" ــــ میں نے کہا ــــ "دائی وہیں بیٹھی رہی تھی اور وہیں سے چلی گئی یا ایسا تو نہیں ہُوا کہ شاہدہ کسی اور کمرے میں کسی کام سے چلی گئی ہو اور دائی اس کمرے میں چلی گئی ہو جس میں بچّہ سویا ہُوا تھا؟"

"سرکار!" ــــ شرفو نے جواب ــــ "پہلی بات تو یہ ہے کہ مجھ کو پتہ ہی نہیں تھا کہ بچّہ سویا ہُوا ہے اور اگر سویا ہُوا ہے تو کون سے کمرے میں ہے۔ یہ تو اُس وقت پتہ لگا جب بی بی شاہدہ نے رونا چِلّانا شروع کیا تھا کہ بچّہ مرا پڑا ہے۔ میں دوڑتا آیا تب مجھ کو پتہ لگا تھا کہ بچّہ اس کمرے میں سویا ہُوا تھا.... بی بی شاہدہ کے شور شرابہ کرنے سے بہت پہلے چوہدری لہراسب جو شاید بچّے والے کمرے میں لیٹے یا بیٹھے ہوئے تھے باہر چلے گئے تھے۔ پھر مجھ کو یہ یاد ہے کہ بی بی شاہدہ چوہدری صاحب کے جانے کے بعد اُس کمرے میں گئی تھی جو گارے کے قریب تھا۔ بی بی شاہدہ اُس کمرے سے دس پندرہ منٹ بعد نکلی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں کچھ کپڑے تھے جو اُس نے دائی کو دیے تھے۔ دائی کپڑے لے کر چلی گئی۔ اس کے کچھ دیر بعد بی بی شاہدہ کمرے میں گئی اور پھر مجھ کو اُس کی چیخ وپکار اور داد فریاد سنائی دی"۔

"کیا دائی اس سے پہلے اُس کمرے میں گئی تھی؟" ــــ میں نے پوچھا ــــ "میرا مطلب یہ ہے کہ جب شاہدہ دوسرے کمرے میں دائی کے لئے کپڑے لینے گئی تھی، کیا اُس وقت دائی اُس کمرے میں گئی تھی جس میں بچّہ سویا ہُوا تھا؟"

"نہیں جناب!" ــــ شرفو نے جواب دیا ــــ "میرا خیال ہے وہ نہیں گئی تھی اور سچّی بات یہ ہے کہ جناب! میری توجہ اپنے کام میں تھی۔ میں آپ کو

کوئی پکّی بات نہیں بتا سکتا"۔

یہ نوکر تو مجھ کو شک و شبے سے بُری لگتا تھا، لیکن یہ تو ابتدا تھی۔ اس کو میں نے باہر بٹھا دیا، لیکن اس کو ذہن سے نہیں نکالا۔ مجھ کو بتایا گیا کہ باقی سب لوگ بھی آگئے ہیں جن کو میں نے تھانے میں طلب کیا تھا۔ میں نے شاہدہ کو اپنے پاس بلایا۔ اس سے پہلے میں دائی کو بلانے کے لئے کانسٹیبل کو بھیج چکا تھا۔

شاہدہ کا زیادہ تر بیان تو پہلے مجھ تک پہنچ چکا تھا جو میں نے لکھ دیا ہے۔ اب اس کا باقاعدہ بیان لینا تھا۔ اس نے میرے کہنے پر وہ باتیں دہرائیں جو پہلے دو ملاقاتوں میں وہ بتا چکی تھی۔ اب میں اس سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ کس بنا پر اور کس شہادت پر انوری پر شک کرتی ہے۔

"اپنی دائی کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے شاہدہ؟" ــــ میں نے پوچھا۔

"آپ دائی کا پوچھتے ہیں" ــــ اُس نے عجیب سے جذباتی لہجے میں کہا ــــ "میرا دودھ پیتا بچّہ مارا گیا ہے۔ مجھ کو تو اپنے پرائے سب دشمن نظر آتے ہیں۔ کسی کو کیا پتہ جب میرا دودھ اترتا ہے تو میری حالت پاگلوں جیسی ہو جاتی ہے" ــــ اُس کے ساتھ ہی اس نے جو رونا شروع کیا تو میرے واسطے مشکل پیدا ہو گئی کہ اس کو چُپ کس طرح کراؤں۔ اُس نے تو میرے بھی آنسو نکال دیے۔ کچھ دیر بعد وہ سنبھلی اور اس نے میرے سوال کا جواب دیا ــــ "دائی میرے پاس بیٹھی رہی تھی۔ میں تھوڑی دیر کے واسطے اُس کے پاس سے اُٹھ کر اُس کے واسطے کپڑے لینے ایک کمرے میں چلی گئی تھی۔ اس دوران اگر وہ کوئی ہاتھ دکھا گئی ہو تو کچھ کہہ نہیں سکتی۔ ویسے یہ دائی کوئی شریف عورت نہیں۔ یہ آپ کا کام ہے کہ اس کو بلا کر اس کے دل سے راز نکالیں۔ میں آپ کو یہ بتا

سکتی ہوں کہ یہ دائی انوری کے پاس زیادہ آیا کرتی تھی۔ اس سے میں یہ شُبہ کر سکتی ہوں کہ انوری نے میرے بچّے کو اس کے ہاتھوں مروایا ہے"۔

"تمہارا پورا شُبہ انوری پر ہے" —— میں نے کہا —— "دائی کے علاوہ تم کوئی اور وجہ کوئی اور ثبوت یا شہادت بتا سکتی ہو جس سے مجھ کو یقین ہو جائے کہ تمہارا شبہ صحیح ہے؟"

"میں نے اُس کو اپنی آنکھوں سے تو نہیں دیکھا" —— شاہدہ نے جواب دیا —— "میں نے آپ کو پہلے بتایا تھا کہ وہ میرے ساتھ اس گھر میں ٹھیک ٹھاک رہی' لیکن خدا نے مجھ کو بچّہ دیا تو انوری کا برتاؤ کچھ اور طرح کا ہو گیا۔ پھر وہ خاوند کے ساتھ لڑی اور اپنے گھر چلی گئی۔ یہ بھی سوچیں کہ چوہدری نے اُس کو طلاق نہیں دی اور انوری اور اس کے ماں باپ نے ابھی تک طلاق کا مطالبہ بھی نہیں کیا۔ چھ سات مہینے گزر گئے ہیں۔ اس سے مجھ کو شُبہ ہوتا ہے کہ انوری اس کوشش میں ہے کہ چوہدری میرے خلاف ہو جائے اور مجھ کو طلاق دے دے اور وہ پھر واپس آجائے۔ اگر بچّہ زندہ رہتا تو ظاہر ہے کہ چوہدری کا لگاؤ میرے ساتھ رہتا۔ انوری سے اس نے کیا لینا تھا۔ پھر چوہدری کی جائیداد میں سے بھی اس کو حصہ نہیں مل سکتا تھا۔ میری ماں کہتی ہے کہ ان لوگوں نے جائیداد کے وارث کو ختم کر دیا ہے.... اگر یہ بھی نہیں تو اس پر غور کریں کہ انوری نورانی شاہ کے پاس کیوں جاتی ہے۔ نورانی شاہ ظاہری طور پر تعویذ دیتا ہے اور پڑھنے کے واسطے وظیفے بتاتا ہے' لیکن معلوم ہُوا ہے کہ وہ درپردہ کالا عمل کرتا ہے۔ کئی عورتوں نے یہ شُبہ ظاہر کیا ہے کہ بچّے کو کالے عمل سے مروایا گیا ہے"۔

میں نے اس نوجوان ماں پر بہت جرح کی لیکن اُس نے کوئی ٹھوس بات نہ بتائی۔ اُس کی مامتا کا خون ہو گیا تھا اس واسطے وہ جذبات کے غلبے میں تھی۔ اُس

کی بعض باتیں بے معنی اور لاعلمی والی تھیں۔ مثلاً" اس کی توجہ جائیداد پر تھی اور وہ کہتی تھی کہ انوری نے اس کے بچّے کو اس واسطے مروایا ہے کہ بچّہ جائیداد کا وارث تھا۔ اس بے چاری کو معلوم نہیں تھا کہ انوری کو خاوند کی جائیداد سے کچھ بھی نہیں مل سکتا تھا۔

اُس نے میرے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا کہ جب وہ بچّے کو دیکھنے کے واسطے کمرے میں گئی تو بچّے کے منہ کے اوپر کوئی کپڑا نہیں تھا۔ لہراسب نے خیال ظاہر کیا تھا کہ بچّے کے منہ پر کوئی کپڑا آگیا ہو گا۔ شاہدہ نے بچّے کے چہرے کا رنگ کچھ بدلا بدلا سا دیکھا تو اس کے اوپر جُھکی۔ اس کو کچھ شک ہُوا۔ اس نے بچّے کی نبض دیکھی پھر دل پر ہاتھ رکھا اور جب اس کو یقین ہو گیا کہ بچّہ تو مرا ہُوا ہے تو اس نے شور شرابہ کیا۔ پہلے نوکر ہی دوڑ کر باہر گیا اور چوہدری لہراسب کو ڈھونڈ کر لایا۔

"پھر یاد کرو شاہدہ!" —— میں نے کہا —— "دائی کے علاوہ کوئی عورت تمہارے گھر آئی ہو؟"

"کوئی بھی نہیں" —— شاہدہ نے کہا —— "دائی کے سوا اور کوئی عورت نہیں آئی"۔

"کیا یہ صحیح ہے کہ نوکر گارا تیار کر رہا تھا؟"

"ہاں جی!" —— اُس نے جواب دیا —— "وہ صبح سے گارے میں پاؤں مار رہا تھا"۔

"اچھی طرح یاد کر کے بتاؤ" —— میں نے کہا —— "جب بچہ سو گیا تھا تو نوکر شرفو بچے والے کمرے میں گیا تھا؟"

"اُس کے پاؤں گارے سے لتھڑے ہوئے تھے" —— شاہدہ نے جواب دیا —— "اُس نے کمرے میں جا کر کیا کرنا تھا۔ چوہدری صاحب اسی کمرے میں

تھے۔ انہوں نے بھی اس کو نہیں بلایا تھا"۔

"کل تم نے مجھ کو ایک بات بتائی تھی" ــــ میں نے کہا ــــ "تم نے کہا تھا کہ یہ نوکر چالاک اور ہوشیار ہے۔ میں نے اس میں کوئی ہوشیاری اور چالاکی نہیں دیکھی"۔

"ہے تو چالاک آدمی!" ــــ اُس نے جواب دیا۔

"ایک بات بتاؤ شاہدہ!" ــــ میں نے ذرا رازداری کے لہجے میں کہا ــــ "شرفو انوری کے مقابلے میں تم کو زیادہ اچھا سمجھتا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ تم اس کو تنخواہ کے علاوہ بھی پیسے دیتی رہتی ہو اور اس نے تمہارا ایک راز کسی کو نہیں بتایا"۔

"کون سا راز؟" ــــ شاہدہ نے چونک کر پوچھا۔

"یہ کوئی راز والی بات تو نہیں" ــــ میں نے کہا ــــ "میں یہ کہتا ہوں کہ شرفو تمہارا ہر حکم مانتا ہے۔ تم نے اس کو کہا کہ چوہدری لہراسب کو پتہ نہ لگنے دے کہ آصف اس کی غیر حاضری میں تمہارے پاس آتا ہے۔ شرفو نے آج تک چوہدری کو پتہ نہیں لگنے دیا"۔

معلوم نہیں میں نے یہ بات کس مطلب کے واسطے کہہ دی تھی، میں نے دیکھا کہ شاہدہ کے چہرے کا رنگ لاش کی طرح ہو گیا۔ وہ بیس اکیس سال کی لڑکی تھی۔ اُس کا رنگ کچھ سانولا سا تھا، لیکن یہ سانولا رنگ پیلا زرد ہو گیا، لیکن میں نے اس کو اہمیت نہ دی۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ ماں نے اپنے بچّے کو خود مروایا ہو۔ اگر اس لڑکی کے کوئی ایسے ویسے تعلقات آصف کے ساتھ تھے تو اُن کا تعلق بچّے کے قتل کے ساتھ جڑ ہی نہیں سکتا تھا۔ میں اپنا مغز مار مار کر اس نتیجے پر پہنچا کہ شاہدہ کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت یا شہادت نہیں۔ انوری نے اس پر یہ الزام لگایا تھا کہ یہ بچّہ چوہدری لہراسب کا ہے ہی نہیں۔ انوری کی ماں

نے شاہدہ کی بے عزتی کر دی تھی۔ اس واسطے وہ انوری کو ہی پھنسانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے شاہدہ کو باہر نکالا اور لہراسب کو بلا لیا۔

ایک طرف محبت دوسری طرف طوائفوں جیسا میک اپ

"لہراسب بھائی!" ــــ میں نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا ــــ "یہ تو پتہ لگ گیا ہے کہ بچّے کو کس طریقے سے مارا گیا ہے۔ تمہاری یہ بیوی تمہاری پہلی بیوی انوری پر شبہ کرتی ہے، لیکن کوئی ٹھوس اور مضبوط بات نہیں کرتی۔ مجھ کو یہ بتاؤ کہ میں انوری کو پکڑ لوں تو کس وجہ سے پکڑوں۔ کیا اُس وقت انوری تمہارے گھر میں موجود تھی یا کیا دائی نے بچّے کو مارا ہے یا نوکر نے مارا ہے؟ اُس وقت تمہارے گھر میں یہی دونوں موجود تھے"۔

"مجھ کو انوری پر ذرا سا بھی شُبہ نہیں، ــــ لہراسب نے کہا ــــ "اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس خاندان کی شرافت اور عزت داری مشہور ہے۔ انوری کے دو بھائی ہیں۔ ان میں ایسی کوئی بات نہیں جس سے شک ہو کہ یہ واردات انہوں نے کی یا کروائی ہے۔ میں گھر میں موجود تھا۔ میری بیوی موجود تھی۔ میرا گھرانہ کوئی ایسا ویسا گھرانہ نہیں۔ اللہ کے کرم سے اس شہر پر میرا بھی کچھ رعب داب اور رسوخ ہے۔ آپ کسی اور پر شُبہ کر سکتے ہیں۔ انوری اور اس کے خاندان کے کسی فرد پر کم از کم میں شُبہ نہیں کروں گا۔ مجھ کو یہ دیکھ کر بہت افسوس ہو رہا ہے کہ آپ نے انوری کو تھانے بلایا ہے"۔

"تھانے تو آپ کی دوسری بیوی کو بھی بلایا ہے" ــــ میں نے کہا ــــ "کیا اس پر آپ کو افسوس نہیں آتا؟"

"اتنا نہیں" ــــ لہراسب نے کہا ــــ "شاہدہ اور انوری میں بہت فرق ہے۔ شاہدہ شوباز خاندان کی لڑکی ہے اور انوری میں خاندانی وقار ہے۔ اسی

واسطے میں نے انوری کو طلاق نہیں دی تھی نہ اب دے رہا ہوں۔ شاہدہ کو تو
میں جائیداد کا وارث پیدا کرنے کے واسطے لایا تھا لیکن شاہدہ کے ساتھ بے برکتی
بھی میرے گھر میں آ گئی۔ انوری نے شاہدہ کو خوشی سے قبول کر لیا تھا۔ میں گھر
میں آتا تو ان دونوں کو آپس میں باتیں کرتے یا ہنستے مسکراتے دیکھتا تھا۔ اس سے
میرا دل خوش ہونا چاہئے تھا لیکن نہیں ہوتا تھا۔ انوری مجھ کو خوش کرنے کی
کوشش کرتی تھی لیکن شاہدہ کو بناؤ سنگار کرنے کا شوق تھا۔ وہ طوائفوں کی طرح
میک اَپ کر کے میرے پاس بیٹھ جاتی تھی....

"میرے گھر کے حالات ٹھیک ٹھاک چل رہے تھے لیکن شاہدہ کا قدم
میرے گھر میں پڑا تو نقصان شروع ہو گئے۔ چار کنال زمین کا مقدمہ چل رہا تھا۔
یہ زمین میری تھی۔ فیصلہ میرے حق میں ہوتے ہوتے سکھوں کے حق میں ہو
گیا۔ ایک مہینہ گزرا تو نو دس سیر دودھ دینے والی بھینس مر گئی۔ چھوٹا سا ایک
مکان کرائے پر دیا ہُوا تھا' اس کی چھت بیٹھ گئی....

"شاہدہ نے مجھ کو جائیداد کا وارث تو دے دیا مگر میرے گھر میں جو اطمینان
اور سکون ہُوا کرتا تھا وہ تو ختم ہی ہو گیا۔ آپ میری بات کو سچ ماننا جناب! بچّہ پیدا
ہُوا تو مجھ کو خوشیاں منانی چاہئیں تھیں لیکن میں نے اپنے دل اور دماغ پر بوجھ
محسوس کیا۔ اس طرح پتہ لگتا تھا جیسے یہ خوشی میری قسمت میں نہیں ہے۔
ایک خواب تو ایسا بُرا آیا کہ میں ڈر کر جاگ پڑا۔ مجھ کو اتنے پیارے بچّے سے
بھی ڈر آنے لگا"۔

میں اس شخص سے بچّے کے قتل کے بارے میں کوئی سراغ لینے کی
کوشش میں تھا اور اس نے کوئی اور ہی قصہ شروع کر دیا تھا۔ میں اس واسطے
چُپ کر کے سنتا رہا کہ بے چارے کو اتنے ارمانوں سے اور درگاہوں' خانقاہوں
اور پیروں وغیرہ کے گھروں میں سجدے کرتے اور نذرانے دیتے اللہ نے بچّہ دیا

تھا اور وہ بھی دوسری بیوی کے بطن سے حاصل ہُوا تھا' اللہ نے وہ بھی واپس
لے لیا۔ اگر بچّہ قدرتی موت مرتا تو اور بات تھی' بچّہ قتل ہو گیا تھا۔ اس شخص
کا تو خون انتقام کے جوش سے اُبل رہا تھا۔ میں نے اپنے دل سے کہا کہ یہ جو
بھی کہنا چاہتا ہے' اسے کہنے دیا جائے۔ اس نے یہ نہیں بتایا کہ اس نے خواب
کیا دیکھا تھا اور میں نے پوچھا بھی نہیں۔

"سب سے بڑی نحوست تو گھر میں بچّہ پیدا ہونے کے بعد آئی"—— وہ بولتا
جا رہا تھا—— "بچّہ دو ماہ کا ہو گیا تو انوری جو میرے ساتھ اور شاہدہ کے ساتھ
اتنے اچھے طریقے سے رہتی تھی' میرے ساتھ لڑ پڑی اور اپنے گھر چلی گئی۔
میں انوری کی جدائی برداشت نہیں کر سکتا تھا"۔

"لڑائی کی کوئی وجہ ہو گی؟"—— میں نے کہا۔

"ایسا لگتا ہے جیسے کسی دشمن نے میرے گھر پر کالا عمل کرا دیا ہے"——
اُس نے کہا—— "انوری اچانک میرے واسطے غیر ہو گئی۔ کہنے لگی کہ آپ کو
حرامی بچّے کی ضرورت تھی تو میں ان پانچ سالوں میں تین نہیں تو دو بچّے ضرور
دے دیتی لیکن چوہدری صاحب' میں زہر کھا کر مر سکتی ہوں' ناجائز بچّہ پیدا نہیں
کر سکتی"۔

اُس نے انوری کی لڑائی کا پورا قصہ سنایا جو میں مختصر کر کے لکھ دیتا ہوں۔
پوری لڑائی سُن کر آپ کیا کریں گے۔ انوری نے لہراسب کو کہا کہ شاہدہ کا جو
بچّہ پیدا ہُوا ہے یہ لہراسب کا نہیں کسی اور کا ہے۔ لہراسب نے انوری کو کہا کہ
تم حسد کی وجہ سے شاہدہ پر ایسا شرمناک الزام لگا رہی ہو۔ لہراسب کا تو یہی
خیال تھا کہ انوری کے دل میں حسد پیدا ہو گیا ہے' اس واسطے اُس نے انوری کو
سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ جھوٹی الزام تراشی کا گناہ نہ کرے۔ لہراسب نے
انوری کو قسمیں کھا کھا کر یقین دلایا کہ شاہدہ ایک درجن بچّے پیدا کر دے پھر

بھی اس کے دل میں انوری کی ہی محبت رہے گی۔

لہراسب نے بتایا کہ انوری کو معلوم نہیں کیا ہو گیا تھا کہ وہ ٹھنڈی ہونے کی بجائے غصے سے پاگل ہوتی چلی گئی اور یہی کہتی رہی کہ شاہدہ کا بچّہ لہراسب کا نہیں کسی اور کا ہے۔ اتنے زیادہ غصے میں انوری نے لہراسب کو ایک دو ایسی باتیں کہہ ڈالیں کہ لہراسب کے دماغ کو بھی غصہ چڑھ گیا۔ پھر لہراسب نے اس کو یہ کہا کہ تم سمجھتی ہو کہ میں اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں۔ انوری نے کہا کہ تم اس قابل ہوتے تو آج اس گھر میں حرام کی اولاد پیدا نہ ہوتی۔

کوئی مرد ایسی چوٹ برداشت نہیں کر سکتا۔ لہراسب نے انوری کو ایک دو ایسی بُری باتیں کہہ ڈالیں کہ انوری اپنے والدین کے گھر چلی گئی۔ لہراسب کہتا تھا کہ شاہدہ میں اور نقص ہو سکتے ہیں لیکن میں یہ نہیں مانوں گا کہ اُس نے مجھ کو دھوکہ دے کر کسی اور کا بچّہ پیدا کیا ہے۔ لہراسب کو امید تھی کہ انوری کا غصہ اُتر جائے گا تو وہ واپس آجائے گی۔ لیکن ایک مہینے تک وہ واپس نہ آئی تو لہراسب نے کسی عورت کے ذریعے انوری کو پیغام بھیجا کہ واپس آجاؤ لیکن انوری نے آنے سے انکار کر دیا۔ شاہدہ بھی انوری کو واپس لانے کی غرض سے گئی تھی لیکن انوری اور اس کی ماں نے شاہدہ کی بے عزتی کر کے رخصت کر دیا۔ یہ میں پہلے تفصیل سے لکھ چکا ہوں۔

"یہ بہت بڑی نحوست تھی کہ انوری چلی گئی"—— لہراسب نے مجھ کو سنایا —— "مجھ کو اس طرح لگا کہ میرا گھر اُجڑ گیا ہے۔ شاہدہ صرف بچّہ دے سکتی تھی، وہ انوری کی جگہ پوری نہیں کر سکتی.... اور اب دیکھیں میرے اوپر کیا قیامت ٹوٹی ہے"۔

خاوند بھی ٹھیک بیوی بھی ٹھیک پھر؟

"چوہدری لہراسب!"—— میں نے کہا—— "میں نے تمہاری وہ ساری باتیں سُنی ہیں جن کا اس واردات کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ میں سوچتا تھا کہ تم کو چُپ کرا دیا تو تمہارے دل کو دکھ ہو گا۔ اب وہ بات کرو جس سے مجھ کو قاتل کا کوئی سراغ ملے، کوئی اشارہ ملے۔ شک مجھ کو بھی انوری پر تھا۔ یہ واردات اُسی نے کروائی ہو گی۔ لیکن تم کہتے ہو کہ انوری اور اس کے خاندان کا کوئی فرد ایسی خطرناک واردات نہیں کر سکتا۔ سوچ کر بتاؤ کہ تمہارا یا شاہدہ کا دشمن کون ہے"۔

"ایک بات پر غور کریں"—— اُس نے کہا—— "اگر مجھ کو انوری پر شُبہ ہوتا تو میں سب سے پہلا کام یہ کرتا کہ اس کو طلاق دیتا۔ یہ بھی سوچیں کہ وہ اتنی بد طینت ہوتی تو مجھ کو کہتی کہ طلاق دو۔ پانچ چھ مہینے ہو گئے ہیں، اس نے طلاق کا مطالبہ نہیں کیا"۔

"آپ کا نوکر شرفو کیسا آدمی ہے؟"—— میں نے پوچھا۔

"ٹھیک آدمی ہے"—— لہراسب نے جواب دیا—— "یہ شُبہ بھی دماغ سے نکال دیں کہ اُس نے کسی سے پیسے لے کر میرے بچّے کو قتل کیا ہے"۔

یہ تو میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا کہ شرفو کا اس واردات کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔

"دائی بھی شاہدہ کے پاس بیٹھی رہی تھی"—— میں نے کہا—— "کیا اُس پر شُبہ ہو سکتا ہے؟"

"یہ بڑی استاد عورت ہے"—— لہراسب نے کہا—— "اس پر شُبہ کیا جا سکتا ہے لیکن میرا دل نہیں مانتا۔ میں نے اس بچّے کی پیدائش پر اس کو جو انعام نقد

اور جو کپڑے دیئے تھے' یہ وہ ساری عمر نہیں بھولے گی' لیکن جنابِ عالی! روپے پیسے میں بڑی طاقت ہے۔ ہو سکتا ہے یہ عورت لالچ میں آگئی ہو"۔

شاہدہ نے بھی دائی کی بابت ایسی ہی رائے دی تھی۔ اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ دائی انوری کے پاس زیادہ آتی جاتی تھی۔

"انوری نے ایسا الزام کیوں لگایا تھا کہ شاہدہ کا بچّہ تمہارا نہیں؟" ـــــ میں نے پوچھا ـــــ "پانچ سال انوری سے بچّہ نہیں ہُوا۔ تم نے اپنا اور انوری کا ٹسٹ کروایا تھا؟"

"ہاں جی!" ـــــ لہراسب نے جواب دیا ـــــ "ہم دونوں میں کوئی نقص نہیں۔ پھر معلوم نہیں انوری کی اولاد کیوں نہیں ہوئی"۔

میں جانتا تھا کہ ایسے ہوتا ہے کہ خاوند بھی ٹھیک اور بیوی بھی ٹھیک ہے لیکن اولاد نہیں ہوئی۔ لہراسب اور انوری میں کوئی نقص تھا یا نہیں اور یہ بچّہ لہراسب کا تھا یا کسی اور کا' اس کا اس واردات اور تفتیش کے ساتھ کوئی تعلق نہیں بنتا تھا۔ اصل معاملہ یہ تھا کہ ایک بچّہ قتل ہو گیا تھا اور میں نے قاتل کو پکڑنا تھا۔

لہراسب نے مجھ کو مایوس کر دیا۔ اکثر لوگ ویسے ہی کسی نہ کسی پر شک لکھوا دیتے ہیں لیکن لہراسب نے اپنا کوئی شک ظاہر نہ کیا بلکہ میں کسی پر شُبہ کرتا تو وہ اس پر لکیر پھیر دیتا تھا۔ لہٰذا میرے واسطے کام بہت ہی مشکل ہو گیا۔

"غور کرو لہراسب بھائی!" ـــــ میں نے کہا ـــــ "یہ بات بالکل صاف ہے کہ قاتل باہر سے نہیں آیا۔ قاتل گھر میں موجود تھا۔ گھر میں تم تھے۔ دائی تھی۔ نوکر تھا۔ تمہاری بیوی شاہدہ تھی۔ ان سب کی موجودگی میں باہر سے کوئی آکر بچّے کو قتل کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا' لیکن یہ حقیقت ہے کہ بچّہ قتل ہُوا ہے' پھر یہی کہہ سکتے ہیں کہ قاتل ان ہی میں ہے جو گھر میں موجود تھے"۔

"یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ماں یا باپ نے اپنے بچّے کو قتل کیا ہو" ـــــ لہراسب نے کہا ـــــ "پیچھے دائی اور نوکر رہ جاتے ہیں"

"یہ تو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ ماں باپ اپنے بچّے کو قتل کر سکتے ہیں" ـــــ میں نے کہا ـــــ "تم کہتے ہو کہ نوکر پر تم کو شک نہیں...."

مجھ کو اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے یہ بات مکمل نہیں کی تھی اور لہراسب کو میں نے کہا تھا کہ اپنی بیوی کو ساتھ لے کر گھر چلا جائے۔ وہ چلا گیا۔ تھانے میں انوری رہ گئی تھی اور شرفو تھا۔ اس کو میں نے ابھی فارغ نہیں کرنا تھا۔ دائی کو بھی میں نے بلوایا تھا۔

میں نے آصف کا نام لہراسب کے سامنے دانستہ نہ لیا۔ میں نے پہلے لکھا ہے کہ آصف لہراسب کی غیر حاضری میں شاہدہ کے گھر جایا کرتا تھا اور شاہدہ شرفو کو کہتی تھی کہ چوہدری لہراسب کو پتہ نہ لگنے دینا کہ ان کی غیر حاضری میں آصف آیا اور شاہدہ کے پاس بیٹھا رہا تھا۔ شرفو نے بتایا تھا کہ شاہدہ اس کو تنخواہ کے علاوہ پیسے دیتی تھی اور آصف بھی شرفو کو انعام دیتا تھا۔

میں نے اس شخص آصف کی بابت بہت سوچ بچار کی۔ میں یہ بات سمجھ گیا تھا کہ آصف اور شاہدہ کے تعلقات صحیح نہیں۔ یہ گڑ بڑ والا معاملہ تھا' اسی وجہ سے یہ ملاقاتیں لہراسب سے چھپاتے تھے۔ میں یہ سوچتا تھا کہ ان کی ناجائز دوستی کا تعلق بچّے کے قتل کے ساتھ بنتا ہے یا نہیں۔ میری عقل کہتی تھی کہ ان کی آپس میں محبت تھی۔ آصف اپنی محبوبہ کے بچّے کو کس واسطے قتل کرتا؟ پھر بھی میں نے آصف کو اپنے دل میں محفوظ کر لیا۔ اس سے کوئی سراغ مل سکتا تھا۔

رات کے ساڑھے آٹھ بج گئے تھے۔ میں صبح سے اس تفتیش میں لگا ہُوا تھا۔ دماغ پلپلا ہو گیا تھا۔ دوپہر کا کھانا تین ساڑھے تین بجے بڑی جلدی میں کھایا

تھا۔ دماغ تازہ کرنے کے واسطے میں گھر چلا گیا۔ وردی اتاری' نہایا اور پرائیویٹ کپڑے پہن کر کھانے پر بیٹھا اور بیوی کو کہا کہ میں نے فوراً واپس تھانے جانا ہے۔ ایک عورت کو بٹھایا ہُوا ہے' اس کا بیان لینا ہے۔ مجھ کو پتہ نہیں تھا کہ سالن اور روٹیاں تو گرم ہیں لیکن بیوی ان سے زیادہ گرم ہے

"ہاں ہاں!"—— بیوی نے سخت طنزیہ لہجے میں کہا—— "عورتوں کے بیان نہا دھو کر اور اپنے کپڑے پہن کر رات کو ہی لئے جاتے ہیں.... دن کو اس کو کیوں نہیں بلایا؟"

میں ایک منٹ میں تھانیداری سے معطل ہو کر مُشتبہ بن گیا۔ میں نے بیوی کو واردات سنائی پھر تفتیش درجہ بدرجہ سنائی اور بتایا کہ اس عورت کا اب نمبر آیا ہے اور میں اس کو یہ مہلت نہیں دینا چاہتا کہ صبح آئے۔ میں نے یہ بیان ہنستے ہنستے دیا۔ بیوی چُپ تو ہو گئی لیکن اُس کا چہرہ گواہی دیتا تھا کہ وہ راضی نہیں ہوئی۔

تھانیدار اور ڈاکٹر کی پوزیشن ایک جیسی ہے۔ ڈاکٹر کے پاس مریضہ اور تھانیدار کے پاس ملزمہ آتی ہے۔ بیویوں کو تو شبُہ ہونا ہی ہوتا ہے۔ میرا ایک ڈاکٹر دوست تھا۔ اُس کا اپنا کلینک تھا۔ ایک روز میرے دوست نے مجھ کو سنایا کہ ایک دو روز پہلے اس کی بیوی کسی کام سے کلینک میں آگئی۔ اُس وقت ڈاکٹر کے پاس ایک جوان اور گورے رنگ کی مریضہ بیٹھی ہوئی تھی اور ڈاکٹر نے اس کے سینے پر ٹوٹی رکھی ہوئی تھی۔ بیوی نے اپنے کام کی بات کی اور چلی گئی۔

رات کو ڈاکٹر گھر آیا تو بیوی کی ناک کا زاویہ بدلا ہُوا تھا۔ بیوی نے ڈاکٹر سے اُس بات پر جواب طلبی کی کہ اس نے ایک بڑی خوبصورت مریضہ کے سینے پر ٹوٹی رکھی ہوئی تھی' لہٰذا ڈاکٹر وجہ بیان کرے کہ کیوں نہ اس کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے.... ڈاکٹر نے بیوی کو بتایا کہ اس مریضہ کو سانس کی

تکلیف تھی اس واسطے سینے پر ٹوٹی لگا کر پھیپھڑوں کو چیک کرنا ضروری تھا۔

"آپ کو معلوم تھا کہ اسے سانس کی تکلیف ہے تو ٹوٹی لگانے کی کیا ضرورت تھی؟"—— بیوی نے کہا—— "جو ڈاکٹر شریف ہوتے ہیں وہ پیٹھ پر ٹوٹی لگا کر پھیپھڑے چیک کر لیا کرتے ہیں.... اگر پھر کبھی آپ نے کسی مریضہ کے سینے پر ٹوٹی لگائی تو میں میکے چلی جاؤں گی"۔

تھانیداروں اور ڈاکٹروں کی بیویاں چاہے اکٹھی ہو کر لانگ مارچ کر لیں۔ تھانوں اور ہسپتالوں کا گھیراؤ کر لیں' پتھراؤ کر لیں' تھانیدار اور ملزمہ کا' ڈاکٹر اور مریضہ کا رشتہ نہ کبھی ٹوٹ سکا ہے نہ کبھی ٹوٹ سکے گا۔

میں اپنی بیوی کی بات کر رہا تھا۔ میں نے اس کو کہا کہ تم بھی تھانے چلی چلو۔ اس عورت کا بیان تم لینا۔ میں نے اس سے جو سوال کرنے ہوئے وہ تمہاری معرفت کروں گا۔ اس نے بڑے اچھے انداز سے کہا' جائیں جائیں' اپنا کام کریں۔

میں تھانے میں داخل ہُوا تو مشتبہ سے تھانیدار بن گیا۔ ایک کانسٹیبل کو بلا کر کہا کہ انوری کو اندر بھیج دے۔

بددعائی ہوئی لڑکی

انوری کے ساتھ اس کا باپ بھی میرے پاس آگیا۔ وہ چہرے' لباس اور ہر لحاظ سے صاحبِ حیثیت اور پُروقار لگتا تھا۔ اس کے چہرے پر اُداسی اور پریشانی صاف نظر آرہی تھی۔ وہ اپنی بیٹی کے واسطے پریشان ہو رہا تھا۔ اُس نے بتانا شروع کر دیا کہ اس نے کس طرح لہراسب کو اپنی بیٹی کا رشتہ دیا تھا۔

"محترم!"—— میں نے اس کو مزید بولنے سے روک دیا اور کہا—— "میں آپ کی پریشانی سمجھتا ہوں - یہ تو آپ کو معلوم ہو گا کہ میں مسلمان ہوں۔ مجھ

کو افسوس ہے کہ میں نے آپ کی بیٹی کو صبح سے اب تک روکا ہُوا ہے۔ یہ
میری مجبوری ہے۔ میرا کام ہی ایسا ہے۔ آپ کی بیٹی یہاں بالکل محفوظ رہے
گی۔ اس پر کوئی الزام نہیں۔ آپ میری مدد کر سکتے ہیں۔ بچّے کے قتل کے
سلسلے میں آپ کو کوئی بات معلوم ہو تو تھانے میں آکر مجھ کو بتائیں۔ میرا مطلب
یہ ہے کہ آپ بھی جاسوسی اور سراغرسانی کریں"۔

ایسی کچھ اور باتیں کہہ کر میں نے اس کو تسلّی دی۔ اس کو باہر نکالا اور
انوری کو اپنے پاس بٹھایا۔ وہ پچّیس چھبیس سال عمر کی لڑکی تھی۔ اُس کا رنگ
گورا تو نہیں تھا' ذرا سفیدی مائل تھا۔ اُس کے نقش اتنے اچھے تھے اور جسم کی
ساخت ایسی تھی کہ دیکھنے والا اس میں کشش محسوس کرتا تھا۔ چہرے اور انداز
سے وہ عقل والی لگتی تھی اور مجھ کو اس میں خود اعتمادی نظر آرہی تھی۔

اُس کی گھبراہٹ ختم کرنے اور اس کو اپنے ساتھ بے تکلّف کرنے کے
واسطے میں نے اس کے ساتھ اصل معاملے سے ہٹ کر کچھ باتیں کیں۔ پھر
اس کی سوکن شاہدہ کے خلاف کچھ نازیبا الفاظ کہے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ
لہراسب کے گھر صرف تم جیسی پُروقار لڑکی اچھی لگتی ہے۔ میں نے انوری کو
بولنے کا موقع دیا۔ وہ زیادہ نہیں بولتی تھی۔ میں نے لہراسب کے خلاف ایک
بات شروع کی تو وہ بول پڑی۔

"چوہدری لہراسب ٹھیک آدمی ہے"—— انوری نے کہا۔ —"میں اُس پر
اپنی جان بھی قربان کر دوں۔ اُس نے بھی میرے واسطے بہت کچھ برداشت کیا
ہے۔ اُس نے تو کہہ دیا تھا کہ اولاد نہیں ہوتی تو نہ سہی' میں تم کو نہیں
چھوڑوں گا لیکن اس کی ماں' دو بہنیں اور ایک خالہ ایسی اُس کے پیچھے پڑ گئیں
کہ اس کو دوسری شادی کے واسطے مجبور کر دیا۔ انہوں نے پیروں اور عاملوں
اور ایک مولوی سے کہلوایا کہ انوری بددعائی ہوئی لڑکی ہے اور اس پر نحوست کا

سایہ ہے' اس کی کوکھ سے بچّہ ہو ہی نہیں سکتا۔ پھر وہ اس کو کہتی تھیں کہ اتنی
زیادہ جائیداد کا وارث کون ہو گا....

"چوہدری نے ان کا بہت مقابلہ کیا۔ انہوں نے میرے چال چلن کو بھی
خراب اور مشکوک کہا۔ چوہدری نے ایک نہ مانی اور میرا ساتھ دیا۔ میں کچھ
کہہ نہیں سکتی کہ چوہدری لہراسب پر انہوں نے کیا جادو چلایا کہ وہ راضی ہو
گیا۔ وہ میرے آگے رو پڑا۔ اس نے کہا کہ تم مجھ کو چھوڑ کر چلی نہ جاؤ تو میں
دوسری شادی کر لوں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ میرے گھر کی اور میرے دل کی
مالک تم ہو گی....

"میں نے دیکھا کہ اس کو اولاد کی خواہش ہے جو ہر مرد اور عورت میں
ہوتی ہے تو میں نے اس کو کہا کہ شادی کر لو اور میں اپنی سوکن کو سینے سے لگا کر
رکھوں گی۔ اس کی ماں' بہنیں اور خالہ پہلے ہی شاہدہ کے رشتے کی بات پکّی کر
چکی تھیں۔ شاہدہ کے والدین لالچی اور گھٹیا لوگ ہیں۔ یہ صرف میں نہیں کہتی'
آپ جس سے مرضی ہے' پوچھ لیں۔ انہوں نے بڑی خوشی سے اپنی بیٹی
چوہدری لہراسب کو دے دی۔ شاہدہ نے آتے ہی چوہدری صاحب کو بچّہ دے
دیا۔ مجھ کو وہیں سے شک ہو گیا کہ یہ بچّہ چوہدری کا ہو ہی نہیں سکتا۔ بچّہ جب
دو تین مہینے کا ہُوا تو ایک دن مجھ کو اس بات پر غصہ آگیا کہ یہ گھر کتنا پاکیزہ ہُوا
کرتا تھا لیکن یہاں کیا ناپاک حرکتیں شروع ہو گئی ہیں"۔

انوری نے شاہدہ کی نحوست کے وہی اثرات اور واقعات سنائے جو لہراسب
نے مجھ کو سنائے تھے۔ میں نے یہ ساری رام کہانی سُنی' لیکن میری توجہ انوری
کے اس الزام پر تھی کہ بچّہ لہراسب کا نہیں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ پھر یہ
بچّہ کس کا ہے۔ میرا یہ سوال سُن کر انوری کچھ دیر چُپ رہی۔

"میں ایسا کوئی آدمی نہیں بتا سکتی" ـــــ انوری نے ذرا ہچکچا کر جواب دیا۔

"پھر تو میں یہ کہوں گا" ـــــ میں نے کہا ـــــ "کہ تمہارا یہ الزام حسد کی وجہ سے ہے۔ اگر تمہارے دل میں اتنا حسد ہے تو پھر کچھ باتیں ایسی ہیں جو تمہارے خلاف بھی جاتی ہیں۔ پھر میں یہی کہوں گا کہ بچّے کو مروانے میں تمہارا ہاتھ ہے"۔

وہ تو تڑپنے لگی۔ تین چار مرتبہ اس نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ ہاتھ جوڑ کر آسمان کی طرف کئے اور "یا اللہ یا اللہ" کہنا شروع کر دیا۔

"اگر آپ میرے اوپر یہ الزام تھوپیں گے" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "تو میری بے گناہی کی گواہی اللہ کی ذات دے گی .... اللہ کس طرح گواہی دے گا؟ یہ بھی آپ دیکھ لینا"۔

"چوہدری لہراسب کی زبانی مجھ کو بہت سی باتوں کا پتہ لگا ہے" ـــــ میں نے کہا ـــــ "تم ایک طرف چوہدری لہراسب پر اپنی جان بھی قربان کرنے کے واسطے تیار ہو اور دوسری طرف تم کو اسی چوہدری لہراسب پر اتنا زیادہ غصہ آیا کہ تم نے اس سے علیحدگی اختیار کر لی۔ صاف پتہ لگتا ہے کہ تم کو یقینی طور پر پتہ ہے کہ بچّے کا باپ کون ہے"۔

"بات یہ ہے" ـــــ انوری نے کہا ـــــ "میں نے یہ الزام یقینی طور پر اس بنا پر لگایا ہے کہ مجھ کو یقین ہے کہ چوہدری لہراسب اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں۔ ویسے وہ ہر لحاظ سے ٹھیک ٹھاک ہے، لیکن قدرت نے اس کو اولاد کی نعمت سے محروم رکھا ہے۔ اس کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ پانچ سال اس کا بچّہ نہ ہُوا۔ یہ میرے ٹسٹ کراتا رہا۔ دو ڈاکٹروں اور ایک لیڈی ڈاکٹر نے مجھ کو پورے معائنے کے بعد کہا ہے کہ یہ ٹھیک ہے۔ آپ کو پتہ ہے کہ مرد اپنا ٹسٹ کرانے میں اپنی بے عزتی محسوس کرتے ہیں .... کیا آپ کے سوال کا یہ جواب کافی

نہیں؟"

لہراسب نے اپنے بیان میں مجھ کو بتایا تھا کہ اس نے اپنا ٹسٹ کروایا تھا اور وہ ٹھیک تھا، لیکن میں نے سوچا کہ بچّہ جس کسی کا بھی تھا، اس کا اس واردات کے ساتھ کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ میں آپ کو حقیقت بتاتا ہوں کہ میرا دماغ چکرا گیا اور میں نے اپنے دل میں کہا کہ یہ کیس میری سروس کا سب سے زیادہ مشکل کیس ہے۔ میں اتنا زیادہ پریشان ہو گیا کہ مجھ کو یہ خیال آیا کہ کسی عامل سے پوچھوں۔ یہ خیال اس وجہ سے آیا کہ لوگ ایک دوسرے پر کالا عمل کروا کے بربادی پھیر دیتے ہیں تو یہ بھی ممکن ہے کہ کس نے کالے عمل سے ہی سے بچّے کو مروا دیا ہو۔ یہ خیال آتے ہی مجھ کو یاد آیا کہ شاہدہ نے مجھ کو بتایا تھا کہ انوری ایک عامل کے پاس جاتی رہتی ہے جس کا نام نُورانی شاہ ہے۔ میں نے دو تین مرتبہ سنا تھا کہ نورانی شاہ کے ہاتھ میں کچھ طاقت ہے۔ میں اسی وقت اُٹھا اور باہر جا کر ایک ہیڈ کانسٹیبل کو کہا کہ کل سورج نکلنے سے پہلے نورانی شاہ تھانے میں موجود ہو۔

"آصف کو جانتی ہو انوری؟" ـــــ میں نے پوچھا۔

"پہلے تو نہیں جانتی تھی" ـــــ انوری نے جواب دیا ـــــ "شاہدہ کے آنے کے بعد مجھ کو پتہ لگا کہ چوہدری لہراسب کا ایک نیا دوست بنا ہے جس کا نام آصف ہے اور یہ بھی پتہ لگا کہ وہ شاہدہ کے قریبی رشتہ داروں میں سے ہے"۔

"کیا کبھی تم نے دیکھا تھا کہ آصف چوہدری کی غیر حاضری میں تمہارے گھر آیا اور شاہدہ کے پاس کمرے میں بیٹھا رہا ہو؟" ـــــ میں نے پوچھا۔

"نہیں" ـــــ انوری نے جواب دیا ـــــ "میری موجودگی میں ایسا کبھی نہیں ہُوا۔ میں صرف یہ بتا سکتی ہوں کہ شاہدہ آصف کو دیکھ کر بڑی خوش ہوتی تھی اور اس کی خوب خاطر تواضع کرتی تھی"۔

"ایک اور سوال"— میں نے کہا— "اگر میں یہ کہوں کہ یہ بچّہ آصف کا تھا تو تم کیا کہو گی؟"

وہ پھر سوچ میں پڑ گئی اور میں اُس کے منہ کی طرف دیکھتا رہا۔

"اپنی آنکھوں سے دیکھے بغیر میں کوئی الزام نہیں لگاؤں گی"— انوری نے جواب دیا— "میں یہ بھی نہیں کہتی کہ یہ بچّہ آصف کا نہیں اور یہ بھی نہیں کہوں گی کہ بچّہ آصف کا ہی تھا"۔

میں سوچ سوچ کر زِچ ہو گیا کہ انوری سے اور کیا پوچھوں۔ لہراسب نے اس کو بڑے کردار والی عورت بیان کیا تھا اور میں نے اس پر بہت ہی جرح کی تو تھک ہار کر میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ انوری کا اس واردات کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ میں نے انوری پر اتنا زیادہ وقت لگایا کہ تقریباً" آدھی رات گزر گئی۔ میں نے انوری کو کچھ ضروری باتیں کہیں اور اس کے باپ کو بلا کر اس کا شکریہ ادا کیا اور انہیں رخصت کر دیا۔ دائی بھی تھانے میں موجود تھی، لیکن میں نے اُس کو صبح آنے کو کہا اور رخصت کر دیا۔

ایک عامل، سراپا فراڈ

میں اگلی صبح تھانے گیا تو نورانی شاہ آیا بیٹھا تھا۔ میں یہ بات مذاق کے رنگ میں نہیں لکھ رہا۔ یہ حقیقت ہے کہ نوُرانی شاہ کی شکل و صورت ہمارے مذہبی اور سیاسی لیڈر مولانا شاہ احمد نوُرانی سے ملتی تھی۔ میں اُس کو اِس طرح احترام سے ملنا چاہتا تھا جس طرح کوئی ان پڑھ مرید اپنے پیر سے ملتا ہے، لیکن معاملہ اُلٹ ہو گیا کہ نوُرانی شاہ دوڑ کر مجھ تک پہنچا اور میرے گھٹنے چھُو لئے پھر میرے ہاتھ چوُمے اور مجھ کو یہ تاثر دیا کہ وہ نہیں بلکہ میں نوُرانی شاہ ہوں۔

میں اس کو اپنے دفتر میں لے گیا۔

"فرمایئے جناب!"— نوُرانی صاحب نے فدویانہ لہجے میں پوچھا— "بندے کو کیوں یاد فرمایا ہے؟.... میں کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

میں نے اس کو واردات سنا دی اور کہا کہ کچھ پتہ نہیں لگ رہا کہ قاتل کون ہے۔ آپ میری مدد کر سکتے ہیں۔

میری بات سن کر پہلے تو اس نے چھت کی طرف دیکھا پھر دائیں بائیں دیکھنے لگا اور پھر اس کی نظریں میرے منہ پر لگ گئیں اور پھر آہستہ آہستہ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی۔ مجھ کو سمجھ آ گئی کہ جناب شاہ صاحب اندر سے خالی ہیں۔

"شاہ صاحب!"— میں نے کہا— "اگر آپ کا علم اور تجربہ وہاں تک نہیں پہنچتا تو پریشان نہ ہوں۔ کہہ دیں کہ یہ آپ کے بس میں نہیں"۔

"جنابِ من!"— نوُرانی شاہ نے مسکراتے ہوئے کہا— "آپ بھی دیہاتی پبلک کی طرح بھولے بادشاہ ہیں۔ میں آپ کے زیرِ سایہ روزی کما رہا ہوں۔ اگر مجھ جیسے گنہگار عامل یہ بتا دیں کہ اصل ملزم کون ہے تو تھانیداروں کو تفتیش میں دن رات بھاگ دوڑ نہ کرنی پڑے"— میری توقع کے خلاف اُس نے ہاتھ جوڑے اور کہنے لگا— "میں حضور سے یہ امید رکھوں گا کہ اپنے اس غلام کو بے پردہ نہیں کریں گے۔ سچّی بات ہے کہ مَیں دو تین ٹوُنے ٹوٹکے جانتا ہوں جن کا کچھ اِثر فائدہ ہو جاتا ہے۔ باقی سب زبان کی استادی ہے۔ کسی کا کام اللہ توکّل ہو جاتا ہے اور جس کا نہیں ہوتا اس کو کہہ دیتے ہیں کہ دشمن نے بڑے ہی سخت تعویذ دبائے ہوئے ہیں جن کو نکالنے کے واسطے مجھ کو اپنی جان خطرے میں ڈالنی پڑے گی اور اس پر اتنا خرچ آئے گا جو کوئی سیٹھ بھی نہیں دے سکتا"۔

میں نے اس کو زیادہ بولنے کا موقع نہ دیا۔ مجھ کو پہلے ہی شُبہ تھا کہ یہ سب

چکر بازی ہے۔ میرے پاس ضائع کرنے کے لئے ایک منٹ بھی نہیں تھا۔ میں نے اس سے ایک اور بات پوچھی۔ وہ یہ کہ انوری اور اس کی ماں اس کے پاس جایا کرتی تھیں۔

"ہاں حضور!"—— اس نے جواب دیا—— "یہ ماں بیٹی میرے پاس اولاد کی مراد لے کر آتی رہی ہیں۔ میں نے ان سے بہت پیسے کمائے ہیں اور تعویذ گنڈے دیتا رہا ہوں۔ آخر چوہدری لہراسب کو دوسری بیوی مل گئی۔ اس کے بعد انوری اپنی ماں کے ساتھ آئی تھی۔ انوری تو چُپ کر کے بیٹھی رہی، لیکن اُس کی ماں نے فضول سی بات کہی کہ دوسری بیوی کا بچّہ نہ ہو، ماں کی اس بات پر انوری کو غصہ آگیا اور اس نے ماں کو کہا، امّی! یہ گناہ ہے۔ میں اپنے خاوند کے حق میں ایسی بدنیّتی نہیں کروں گی۔ اگر اللہ اس کو بچّہ دیتا ہے تو مجھ کو خوشی ہو گی .... ماں کو یہ بات کہہ کر انوری نے مجھ کو کہا کہ شاہ جی! آپ کوئی ایسا عمل یا وظیفہ بتائیں کہ میری چوہدری لہراسب اور اس کی دوسری بیوی کے ساتھ بنی رہے اور میری زندگی برباد نہ ہو۔ میں نے ان کو تعویذ وغیرہ دے دیئے اور اس کے بعد وہ نہیں آئیں۔ میرا خیال ہے کہ انوری نے ماں کو نہیں آنے دیا ہو گا"۔

"بہت شکریہ شاہ صاحب!"—— میں نے کہا—— "آپ کے تعویذوں کا یہ اثر پڑا ہے کہ انوری کی زندگی برباد ہو گئی ہے اور وہ پانچ سال بعد اُجڑ کر اپنے ماں باپ کے گھر بیٹھی ہوئی ہے .... آپ تشریف لے جائیں اور ایک بات غور سے سنیں۔ اگر مجھ کو اشارہ بھی ملا کہ آپ نے کبھی کسی جرائم پیشہ یا کسی واردات کے ملزم کی مدد اور حوصلہ افزائی کی ہے تو میں آپ کو اعانتِ جرم میں اندر کرا دوں گا"۔

جناب نُورانی شاہ صاحب اس طرح اُٹھ کر نکلے کہ دروازے سے نکلنے تک پیٹھ میری طرف نہیں کی۔ اس شخص کو بلا کر مجھ کو یہ فائدہ پہنچا کہ ایک یہ پتہ لگ گیا کہ یہ شخص کتنے پانی میں ہے اور دوسرے یہ تصدیق ہو گئی کہ انوری بڑے پاک اور بڑے اونچے کردار کی لڑکی ہے اور اس واردات کے ساتھ اس کا دُور دُور تک کوئی تعلق نہیں بنتا۔

لیکن تعلق کس کا بنتا تھا؟ میرا تو سر گھوم گیا۔

پولیس انسپکٹروں کی کہانیوں سے آپ کو یہ معلوم ہُوا ہو گا کہ کیسے کیسے لوگ پولیس کے مخبر ہوتے ہیں۔ میرے استاد محترم احمد یار خان کئی بار ان مخبروں کا ذکر کر چکے ہیں۔ یہ کوئی معمولی واردات نہیں تھی۔ نورانی شاہ میرے پاس ابھی بیٹھا ہُوا تھا کہ دو معزّز حضرات آگئے تھے۔ یہ اُن لوگوں میں سے تھے جو تھانیدار کی خوشنودی حاصل کرنے کو مذہبی فریضہ سمجھتے تھے۔ ان کو بہانہ چاہئے تھا تھانے آنے کا۔ وہ مل گیا۔ ان میں سے ہر ایک کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ دوسروں سے زیادہ مخبری کرے اور صحیح اطلاع لائے۔ ان لوگوں سے صحیح اور مکمل رپورٹیں ملا کرتی تھیں۔ وہ تین آدمی تھے۔ میں نے گزشتہ رات دائی کو بلوایا تھا۔ وہ بھی آئی بیٹھی تھی۔ میں نے اس کو کہا کہ ابھی چلی جائے میں اس کو خود بلا لوں گا۔

میں نے ان معزّزین کو باری باری اپنے پاس بٹھایا اور ہر ایک کی رپورٹ سنی۔ میں ہر ایک کی الگ الگ رپورٹ نہیں لکھوں گا۔ ان سے مجھ کو جو معلومات حاصل ہوئیں وہ میں مختصر کر کے پیش کر دیتا ہوں۔ ان لوگوں سے کوئی اور ہی ڈرامہ معلوم ہُوا۔ انہوں نے بتایا کہ انوری اسی شہر کے ایک لڑکے اختر کو چاہتی تھی، لیکن شادی لہراسب کے ساتھ ہو گئی اور اختر کی شادی کہیں اور ہو گئی۔ اختر اور انوری شادی کے بعد بھی ملتے ملاتے رہے۔ انوری اختر کے گھر

جاتی تھی اور اختران کے گھر جاتا تھا۔ پھر گھر گرہستی میں اُلجھ کر ان کی ملاقات کم ہو گئی۔ اب انوری لہراسب سے علیحدگی اختیار کر کے ماں باپ کے گھر آبیٹھی تو انوری اور اختر کی ملاقاتیں پھر شروع ہو گئیں۔

ان کا ملنا ملانا اتنا زیادہ ہو گیا کہ اختر کی بیوی نے اعتراض کیا۔ اختر نے بیوی کی پرواہ نہ کی۔ اس کے نتیجے میں میاں بیوی میں ناچاقی پیدا ہو گئی جو اتنی زیادہ بڑھ گئی کہ اختر کی بیوی اپنے ماں باپ کے گھر چلی گئی۔ پھر بھی اختر نے انوری سے ملنا نہ چھوڑا۔ جب لہراسب کو دوسری بیوی نے بچّہ دے دیا تو انوری لہراسب کو لات مار کر گھر آ بیٹھی۔ ان لوگوں کی رائے یہ تھی کہ انوری کا رویّہ ایسا ہے جیسے وہ اختر کی بیوی کو طلاق دلوا کر اُس کے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہے۔ یہ ڈرامہ بہت آگے نکل گیا ہے۔

میں نے ان آدمیوں سے پوچھا کہ اختر میں اتنی ہمت ہے کہ اُس نے لہراسب کے بچّے کو قتل کر دیا ہو یا کسی ذریعے سے کروا دیا ہو؟

تینوں نے مجھ کو یہ جواب دیا کہ انوری کو خوش کرنے کے واسطے وہ ہر خطرہ مول لے سکتا ہے۔ وہ اپنی بیوی کو طلاق دینے پر تُلا ہُوا ہے۔

میں نے ان معزّز مخبروں کی رپورٹیں بہت ہی مختصر کر کے سنائی ہیں۔ اگر پوری سناتا تو آپ کو بھی یہ شبہُ ہوتا کہ بچّے کا قاتل اختر ہو سکتا ہے یا کسی نہ کسی طریقے سے یہ واردات اختر نے کروائی ہے۔ میں نے ان رپورٹوں کی روشنی میں اختر کو شاملِ تفتیش کرنا ضروری سمجھا اور اس کو تھانے طلب کر لیا۔

آدھے گھنٹے بعد وہ میرے سامنے بیٹھا ہُوا تھا۔ وہ ستائیس اٹھائیس سال کی عمر کا خوبرو نوجوان تھا اور شکل صورت اور لباس سے اچھے خاندان کا لگتا تھا۔

مجھ کو یہ توقع تھی کہ میں اس پر سوال کروں گا تو وہ ہر بات سے انکاری ہوتا چلا جائے گا' لیکن اُس نے ہر بات تسلیم کر لی۔ اُس نے یہ بھی تسلیم کیا کہ

شادی سے پہلے اس کی اور انوری کی آپس میں اتنی محبت تھی کہ انہوں نے ایک دوسرے کے ساتھ شادی کرنے کا عہد کر لیا تھا' لیکن ان کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ پھر اُس نے یہ بھی تسلیم کیا کہ شادی کے بعد بھی ان کی ملاقاتیں ہوتی رہیں پھر ملاقاتیں کم ہو گئیں اور اب انوری لہراسب سے الگ ہو کر گھر آگئی تو ملاقاتیں زیادہ ہو گئیں۔

اختر نے ملاقاتیں زیادہ ہونے کی وجہ یہ بتائیں کہ انوری بہت پریشان تھی۔ وہ دل سے لہراسب سے علیحدہ نہیں ہونا چاہتی تھی۔ وہ مجھ سے جذباتی سہارا مانگتی تھی جو میں اُس کو دیتا تھا۔

"اختر بھائی!" —— میں نے کہا —— "تم تو بہت ہی شریف بننے کی کوشش کر رہے ہو۔ مجھ کو تم کس طرح یقین دلا سکتے ہو کہ انوری کے ساتھ تمہارے تعلقات پاک صاف ہیں"۔

"آپ کو یقین دلانے کا میرے پاس کوئی ذریعہ نہیں" —— اُس نے جواب دیا —— "میں قرآن پر ہاتھ رکھ کر قسم کھا سکتا ہوں اور پورے اعتماد کے ساتھ کہتا ہوں کہ ہمارے پاکیزہ تعلقات کا شاہد خدا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کو میری بابت رپورٹیں دی گئی ہوں گی۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ کوئی ایک گواہ ایسا لے آئیں جو یہ کہے کہ اس نے مجھ کو اور انوری کو کہیں الگ تھلگ تنہائی میں اکٹھے دیکھا ہو۔ وہ میرے گھر آتی ہے تو میری بیوی میرے پاس بیٹھتی ہے۔ میں اُس کے گھر جاتا ہوں تو اس کے گھر والوں کے پاس بیٹھتا ہوں"۔

"اب تمہاری بیوی کہاں ہے؟"

"اپنے ماں باپ کے گھر" —— اُس نے جواب دیا —— "ناراض ہو کر گئی ہوئی ہے اور مجھ کو بدنام کرتی پھرتی ہے.... میں آپ کو یہ بتا دیتا ہوں کہ جب

میری شادی کہیں اور' اور انوری کی کہیں اور ہو گئی تو ہم نے عہد کیا تھا کہ اپنی اپنی اَزدواجی زندگی میں دلی طور پر دلچسپی لیں گے اور ہم نے ایسا کر کے دکھا دیا۔ انوری نے لہراسب کو روحانی طور پر قبول کر لیا"۔

"میں نہیں مانتا"—— میں نے کہا—— "اگر انوری کے دل میں لہراسب کی اتنی ہی محبت تھی تو اس کی دوسری بیوی پر جھوٹا الزام لگا کر اُس کو چھوڑ نہ آتی۔ میں نے انوری کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا تھا لیکن وہ کچھ اور نکلی۔ اب تو میں پکّا شُبہ کروں گا کہ لہراسب کے بچّے کو انوری نے ہی مروایا ہے"۔

"کیا انوری نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ اس کو کہاں سے پتہ لگا ہے کہ اس بچّے کا باپ چوہدری لہراسب نہیں؟"—— اختر نے پوچھا۔

"وہ کیسے بتاتی!"—— میں نے کہا—— "وہ کسی کا نام لیتی تو میں اس آدمی کو تھانے بلا کر پوچھ لیتا"۔

"جنابِ عالی!"—— اختر نے بڑے عجیب انداز سے کہا—— "یہ بات اُس کو میں نے بتائی تھی۔ اُس نے میرا نام اس وجہ سے نہیں لیا کہ آپ مجھ کو تھانے بلا کر پریشان کریں گے۔ اُس نے میری عزت رکھی ہے۔ اُس نے مجھ کو آج صبح بتایا ہے کہ یہ بات یا یہ الزام اس نے آپ تک پہنچایا ہے' لیکن آپ کے پوچھنے کے باوجود اس نے میرا نام نہیں لیا۔ میں نے اس کو بتایا تھا کہ یہ اس نے کیا حماقت کی ہے۔ میرا نام لے دینا تھا"۔

"تمہارے پاس کیا ثبوت ہے؟"—— میں نے پوچھا—— "بچّے کا باپ کون ہے؟"

"بچّے کے باپ کا نام آصف ہے"—— اختر نے جواب دیا—— "وہ میرا دوست ہے اور لہراسب کی دوسری بیوی کے ساتھ تو اس کا دوستانہ اور زیادہ گہرا ہے۔ آصف کے ساتھ میری رازداری ہے۔ اُس رازداری کی وجہ سے اس

نے مجھ کو اپنا یہ راز دیا تھا۔ اب آپ کہہ سکتے ہیں کہ اختر تم تو بیوفا اور بے اعتبار دوست ہو کہ اپنے جگری یار کے خلاف تھانے میں بات کر رہے ہو۔ میں اس کا یہ جواب دوں گا کہ آصف کے اس گناہ نے انوری کو اُجاڑ دیا ہے۔ میں انوری پر آصف جیسے ایک درجن دوست قربان کر سکتا ہوں"۔

آصف کی بابت شرفو نوکر نے جو بیان دیا تھا' اس کی تصدیق ہو گئی۔ میں نے اختر کی اس بات پر فوراً یقین کر لیا۔

اختر نے مجھ کو اس معاملے کی بابت پورا بیان دیا جس کا لبِ لباب یہ ہے کہ آصف اور شاہدہ کی دوستی شادی سے پہلے بھی تھی لیکن وہ دوستی ایسی ہی تھی جیسے رشتہ داروں کے آپس میں تعلقات ہوتے ہیں۔ یوں سمجھ لیں کہ ان کی آپس میں ذرا بے تکلّفی تھی۔ آصف اپنے خاندان کے ساتھ شہر میں رہتا تھا۔ شاہدہ بیاہی ہوئی آگئی تو اس کی ملاقات آصف کے ساتھ ہوئی۔ شاہدہ نے آصف کو کہا کہ چوہدری لہراسب لاولد ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ لاولد ہی رہے گا' اس واسطے کہ پہلی بیوی کا پانچ سال گزر جانے کے باوجود بچّہ نہیں ہُوا۔

آصف نے اختر کو راز دار دوست سمجھ کر بتایا تھا کہ شاہدہ نے آصف کو کہا کہ اگر وہ چوہدری لہراسب کو صرف ایک بچّہ دے دے تو اس خاندان میں اس کی پوزیشن مضبوط ہو جائے گی اور پہلی بیوی کو طلاق مل جائے گی۔ آصف کوئی شریف آدمی تو نہیں تھا۔ یہاں سے ان کے تعلقات ناجائز ہو گئے اور اس کے نتیجے میں شاہدہ ماں بن گئی اور سب نے کہا کہ یہ چوہدری لہراسب کا بچّہ ہے۔

اختر نے مجھ کو کہا کہ بے شک آصف کو میرے سامنے بٹھائیں۔ شاہدہ کو بھی لے آئیں۔ میں ان کے سامنے بات کروں گا۔

اختر کے ساتھ کچھ اور باتیں ہوئیں۔ مجھ کو اس شخص نے قائل کر لیا تھا کہ یہ جو کچھ کہہ رہا ہے سچ کہہ رہا ہے۔ میں نے اس کو جانے کی اجازت دے

دی اور اس کو کہا کہ کسی کو پتہ نہ لگے کہ میری اور اس کی کیا باتیں ہوئی ہیں۔

"جناب انسپکٹر صاحب!" ـــــ اختر نے کہا ـــــ "میں آپ سے ایک درخواست کرتا ہوں۔ میں آپ کی ہر طرح مدد کروں گا' لیکن آپ ایک کرم یہ کریں کہ انوری پر کوئی حرف نہ آئے۔ میں جانتا ہوں کہ لہراسب کی ماں' بہنیں اور ایک خالہ اس کو بدنام کرتی پھر رہی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ بچّے کو انوری نے مروایا ہے"۔

میں نے اس کے ساتھ وعدہ کیا کہ میری کوئی کارروائی بلاوجہ نہیں ہو گی۔

دائی نے دماغ خراب کر دیا

دائی رہ گئی تھی۔ اس کو بلایا۔ اس کے بیان سے پہلے یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ آج کل شہروں اور قصبوں کے لوگ دائی کے وجود سے محروم ہو گئے ہیں۔ دائی ہر گاؤں' ہر محلّے اور ہر قصبے کا ایک اہم فرد ہُوا کرتی تھی۔ اب لوگ بچّوں کی پیدائش کے واسطے عورتوں کو ہسپتالوں میں داخل کراتے ہیں یا لیڈی ڈاکٹر کو گھر بلا لیتے ہیں۔ محلّوں میں نرسیں اوزار اور آلات اٹھائے ہوئے پھرتی رہتی ہیں۔

ہمارے وقتوں میں تجربہ کار دائیاں ہوتی تھیں۔ ہر دائی کا اپنا علاقہ ہوتا تھا۔ اپنے علاقے کی ہر عورت سے دائی واقف ہوتی تھی کہ وہ کس حالت میں ہے۔ انہوں نے ہر اس عورت کے دن گِنے ہوئے ہوتے تھے جو امید سے ہوتی تھی۔ پیدائش کے وقت وہ وقت سے پہلے پہنچ جاتی تھیں۔ نہ انجکشن کی ضرورت ہوتی تھی نہ کسی دوائی کی۔ دائی اتنی تجربہ کار ہوتی تھی کہ ہاتھوں سے وہ عورت کو بڑے آرام سے اس تکلیف دہ مرحلے سے گزار دیتی تھی۔

چونکہ دائیاں گھر گھر پھرتی رہتی تھیں اس واسطے وہ ہر گھر کے درپردہ

حالات سے بھی واقف ہوتی تھیں۔ ایسی ویسی عورتوں کے راز دائیوں کو معلوم ہوتے تھے۔ بعض دائیاں خفیہ پیغام رسانی بھی کیا کرتی تھی۔

یہ دائی جس کی میں بات سنا رہا ہوں' ادھیڑ عمر عورت تھی۔ جسم کی سمارٹ تھی۔ چہرے پر تجربہ کاری کی خود اعتمادی تھی اور میں نے اس کے ساتھ باتیں شروع کیں تو پتہ لگا کہ یہ دماغی طور پر بھی سمارٹ ہے۔ اس نے بیان دیا کہ وہ شاہدہ کے پاس گئی تھی اور برآمدے میں اس کے پاس بیٹھی رہی تھی۔ اس نے شاہدہ سے پوچھا تھا کہ بچّہ کہاں ہے۔ شاہدہ نے بتایا تھا کہ اندر سویا ہُوا ہے۔

"بچّہ کون سے کمرے میں سویا ہُوا تھا؟" ـــــ میں نے پوچھا۔

"نہ میں نے پوچھا نہ شاہدہ نے بتایا تھا" ـــــ اُس نے جواب دیا ـــــ "جب میرے کانوں میں پڑی کہ چوہدری لہراسب کا بچّہ مر گیا ہے' اُس وقت میں اپنے گھر میں پہنچ چکی تھی۔ میں دوڑتی ہوئی چوہدری لہراسب کے گھر گئی۔ اس وقت پتہ لگا کہ بچّہ پلنگوں والے کمرے میں سویا ہُوا تھا۔ چوہدری لہراسب کے بارے میں جانتی ہوں کہ وہ اسی کمرے میں تھا اور پھر باہر نکل گیا تھا اور کچھ دیر بعد میں بھی گھر چلی گئی تھی"۔

دائی کا سارا بیان اور اپنی جرح سنانے کی ضرورت نہیں۔ اس سے مجھ کو کوئی ایسی بات معلوم نہ ہوئی سوائے اس کے کہ اس نے یقینی طور پر بتایا کہ شاہدہ اور آصف کی ناپاک دوستی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ بتا سکتی ہے کہ چوہدری لہراسب یا شاہدہ کا ایسا دشمن کون ہے جس نے ان کے بچّے کو ہی قتل کر دیا ہے۔

"میں نہیں جانتی" ـــــ اس نے جواب دیا ـــــ "آپ کو پتہ نہیں لگ سکا تو مجھ کو کیسے لگ سکتا ہے"۔

یہ عورت ہر گھر کا حال احوال جانتی تھی' اس واسطے میں نے اس کے

ساتھ بہت ہی مغز ماری کی۔ اس نے میرے ساتھ بہت تعاون کیا۔ میں نے تھک ہار کر اس کو کہا کہ اس گھر میں اس کی موجودگی میں کوئی اور آیا ہو گا.... مجھ کو اپنے آپ پر غصہ بھی آیا اور افسوس بھی ہُوا کہ میں نے کیسا بیوقوفوں والا سوال کیا تھا۔ دراصل میں ڈوبنے والے آدمی کی طرح ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ اگر وہ آج کل کا زمانہ ہوتا یا میں آج کے زمانے میں تھانیدار ہوتا تو پھر کوئی غم ہی نہیں تھا۔ مقتول بچّے کے وارث دو تین جلوس نکالتے' تھانے کا گھیراؤ کرتے' زندہ باد' مُردہ باد کے نعرے لگاتے' اخباروں میں ایک دن خبر آتی اور ایک دو دن بعد یہ خبر آتی کہ وزیراعلیٰ نے حکم دے دیا ہے کہ بچّے کے قاتل کو فوراً" پکڑا جائے۔ کسی کو معاف نہیں کیا جائے گا.... اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ تھانیدار کو معاف کر دیا گیا ہے اور ضروری نہیں کہ وہ بچّے کے قاتل کی تلاش میں وقت ضائع کرے کیونکہ اس کی اصل ضرورت سیاسی کاموں میں ہے۔

اُس زمانے میں ایک انسان کا خون نہ کوئی قاتل ہضم کر سکتا تھا نہ کوئی تھانیدار۔ مقتول خواہ انتہائی غریب ہی ہوتا' لُولا لنگڑا یا پگلا ہی ہوتا' اس کو ایک انسان سمجھا جاتا تھا۔

دائی نے میرے فضول سے سوال کے جواب میں بتایا کہ اس گھر میں اور تو کوئی نہیں آیا' شاید بھنگن ڈیوڑھی میں آئی تھی۔ بیت الخلا ڈیوڑھی میں تھا۔ اتنا کہہ کر وہ چونک پڑی اور کچھ سوچنے لگی۔

"اب یاد آیا ہے"___ دائی نے کہا___ "ڈیوڑھی میں کچھ آواز سی آئی تھی۔ شاہدہ میرے پاس بیٹھی ہوئی تھی وہ فوراً" اٹھی اور ڈیوڑھی میں چلی گئی۔ بھنگن شاید اُسی وقت آئی تھی۔ کچھ دیر بعد شاہدہ اندر آئی اور میں وہاں سے اٹھی اور اپنے گھر چلی گئی.... ڈیوڑھی میں بھنگن کے علاوہ بھی کوئی آیا تھا"۔

اس کے اس بیان پر بھی میں نے اس سے بہت ساری باتیں کیں اور مجھ

کو محسوس ہونے لگا کہ بھنگن اور شاہدہ کو اس سلسلے میں تھانے بلانا ضروری ہے۔ دائی نے مجھ کو بھنگن کا گھر بتایا۔ میں نے ایک کانسٹیبل کو کہا کہ وہ اس بھنگن کو ساتھ لے کر آئے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ بھنگن آجائے گی تو شاہدہ کو بلاؤں گا۔

دائی کو میں نے یہ کہہ کر گھر بھیج دیا کہ وہ شہر سے باہر نہ جائے۔

بھنگن کا بھید

بھنگن کچھ دیر لگا کر آئی اور اس کے ساتھ ہی ہسپتال سے آدمی آگیا کہ ڈاکٹر صاحب بلاتے ہیں۔ میں ہسپتال چلا گیا۔

"یہ لو محبوب بھائی!"___ ڈاکٹر نے ایک کاغذ میرے آگے کرتے ہوئے کہا ___ تکیے کی رپورٹ آگئی ہے۔ میرا خیال ٹھیک نکلا"۔

ایکسپرٹ نے رپورٹ میں لکھا تھا کہ تکیے پر اسی مواد کا نشان ہے جو بچّے کے منہ سے نکلا تھا۔ اس رپورٹ سے تصدیق ہو گئی کہ بچّے کا سانس اس تکیے سے روکا گیا تھا۔

رپورٹ پر باتیں ہو چکیں تو ڈاکٹر نے پوچھا کہ تفتیش کسی نتیجے پر پہنچی ہے یا نہیں۔ میں نے اس کو بتایا کہ میں تو ہار گیا ہوں۔ کچھ پتہ نہیں چل رہا۔

"اگر مجھ کو قتل کا باعث معلوم ہو جائے تو میں قاتل تک پہنچ سکتا ہوں" ___ میں نے کہا___ "مجھ کو توقع تھی کہ بچّے کا باپ چوہدری لہراسب اپنی پہلی بیوی پر شک کرے گا۔ یہ بیوی اس سے الگ بھی ہو گئی ہے لیکن لہراسب اس کے خلاف بات نہیں سنتا۔ پہلی بیوی نے لہراسب کی دوسری بیوی پر الزام لگایا ہے کہ یہ بچہ لہراسب کا نہیں کسی اور کا تھا.... یہ الزام صحیح معلوم ہوتا ہے"۔

"ارے ہاں محبوب بھائی!"___ ڈاکٹر نے اس طرح کہا جیسے اس کو اچانک

یہ بات یاد ہو گئی ہو ——— "میں آپ کو ایک بات بتانا بھول گیا تھا۔ یہ ذرا غور سے سن لو۔ یہ بچّہ چوہدری لہراسب کا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ پہلے میں نے دیکھا ہی نہیں کہ یہ کس کا بچّہ ہے جو قتل ہو گیا ہے۔ اب آپ نے لہراسب کا ذکر کیا ہے تو یاد آیا ہے۔ بچے کے قتل سے شاید دو اڑھائی مہینے پہلے چوہدری لہراسب میرے پاس آیا تھا۔ کہنے لگا کہ شادی کئے پانچ سال ہو گئے ہیں لیکن اولاد نہیں ہوتی۔ میں نے اس کو مشورہ دیا کہ اپنا اور اپنی بیوی کا چیک اَپ کراؤ۔ اُس نے کہا کہ بیوی کو تین ڈاکٹر دیکھ چکے ہیں۔ اس میں کوئی نقص نہیں ملا۔ میں نے پوچھا کہ تمہارے اپنے چیک اَپ کی رپورٹ کیا ہے؟ اس نے کہا کہ اپنا چیک اَپ کروایا ہی نہیں"۔

"مردوں میں ایک لعنت ہے" ——— میں نے کہا ——— "اولاد نہ ہونے کے معاملے میں ڈاکٹری معائنہ نہیں کراتے۔ اس میں اپنی بے عزتی سمجھتے ہیں' حالانکہ یہ قدرتی معاملہ ہے"۔

"یہ چوہدری انہی مردوں میں سے ہے" ——— ڈاکٹر نے کہا ——— "میں نے اس کو کہا کہ اپنا ٹسٹ کراؤ۔ اگر کوئی نقص نکلا تو اس کا علاج ہو سکتا ہے۔ اس نے کہا کہ اب وہ خود بھی چاہتا ہے کہ ٹسٹ وغیرہ کروائے۔ اس نے کہا کہ وہ کسی سپیشلسٹ کا نام پتہ لینے آیا ہے۔ میں نے اس کو ٹسٹ کی پرچی لکھ دی اور لاہور کے ایک سپیشلسٹ کا ایڈریس لکھ دیا....

"پھر وہ چار پانچ دنوں بعد میرے پاس آیا۔ وہ لاہور گیا تھا۔ اس نے مجھ کو سپیشلسٹ کی لیبارٹری رپورٹ دکھائی جو دیکھ کر مجھ کو بہت افسوس ہُوا۔ قدرت نے اس کو اولاد پیدا کرنے والے جرثوموں سے محروم رکھا تھا۔ بے چارا کچھ بھی نہ بولا اور چلا گیا"۔

اب تو ڈاکٹری ثبوت مل گیا تھا کہ بچّہ لہراسب کا نہیں تھا۔ میں تکیہ اور

رپورٹ جو ڈاکٹر نے سربمہر کر دی تھی' لے کر تھانے آ گیا۔

یہ تو دماغ لڑانے کا کھیل تھا۔ میری کھوپڑی میں اتنا دماغ نہیں تھا۔ جتنا بھی تھا اس کو میں لڑا رہا تھا۔ سوچ سوچ کر مجھ کو ایک نکتہ مل گیا۔ لہراسب اُن دنوں ڈاکٹروں کے پاس گیا تھا جن دنوں بچّہ تین مہینوں کا ہو گیا تھا اور انوری نے اس کو کہا تھا کہ یہ بچّہ اس کا نہیں۔ اس بات پر ان کی لڑائی ہوئی اور انوری اپنے ماں باپ کے ہاں چلی گئی تھی۔ لہراسب نے مجھ کو بتایا تھا کہ اس نے اپنا ڈاکٹری معائنہ کرایا تھا اور وہ بالکل ٹھیک ہے لیکن وہ اس نے جھوٹ بولا تھا۔ اب اس نے اس واسطے ٹسٹ کروایا تھا کہ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ انوری کا الزام صحیح ہے یا غلط۔ رپورٹ نے الزام صحیح ثابت کر دیا۔ یہی وجہ تھی کہ میرے پاس آ کر وہ انوری کی حمایت کرتا تھا۔

مجھ کو ایک اور بات یاد آ گئی۔ لہراسب کے محلّے کے ایک معزّز آدمی نے مجھ کو بتایا تھا کہ بچّے کے قتل سے ڈیڑھ دو ہفتے پہلے لہراسب کی ذہنی حالت نارمل نہیں رہی تھی۔ اتنی زیادہ باتیں کرنے والا اور ایسا ہنس مُکھ آدمی بالکل چُپ ہو گیا تھا۔ محفل میں بیٹھا ہوتا ہے تو صاف پتہ لگتا ہے کہ دماغی طور پر غیر حاضر ہے۔ کسی گہری سوچ میں کھویا رہتا ہے۔ پھر جب اُس کا بچّہ مر گیا تو لہراسب میں کوئی اور ہی تبدیلی آ گئی۔ اب وہ بولتا ہے لیکن اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں۔

اب میں نے بھنگن کو اپنے پاس بٹھایا۔ اُس پر مجھ کو شبہ ہُوا کہ یہ کمروں میں جھاڑو دینے گئی ہو گی اور بچّے کو اس نے سانس روک کر مارا ہو گا۔ اس کو اُس کام کی اجرت دی گئی ہو گی اور قتل کا یہ طریقہ بتایا گیا ہو گا۔

میں نے ایک کانسٹیبل کو بھیجا کہ شاہدہ کو تھانے لے آئے۔

بھنگن سے میں نے پوچھ گچھ شروع کی۔ اس کا بیان لینے کی بجائے میں

سوال کرتا رہا۔ اُس نے اسی بات پر میرے سوال ختم کردیے کہ وہ صرف بیت الخلاء صاف کرتی ہے اور باہر باہر سے ہی چلی جاتی ہے۔ اس نے تو کبھی صحن میں بھی جھاڑو نہیں دیا۔

میرے مزید کریدنے پر اس نے ایک عجیب بات بتادی۔

"میں ڈیوڑھی میں داخل ہوئی"— بھنگن نے کہا— "تو بی بی شاہدہ ڈیوڑھی میں باہر والے دروازے کے ساتھ ہی کھڑی تھی۔ میں نے دروازہ کھولا تو پہلے بی بی نظر آئی پھر مجھ کو اس طرح لگا جیسے کوئی آدمی دروازے کے پیچھے ہو گیا ہو....

"مجھ کو کیا ضرورت تھی یہ دیکھنے کی کہ یہاں کون کون کھڑا ہے۔ ہم غریب لوگ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ میں نے آگے ہو کر ٹوکری جھاڑو رکھا تو پیچھے قدموں کی آواز سنائی دی۔ میں نے پیچھے دیکھا ایک آدمی تھا جو دروازے کے پیچھے سے نکل کر باہر جا رہا تھا"۔

"تم نے اُس کو پہچانا تھا؟"— میں نے پوچھا۔

"ہاں جی!"— بھنگن نے جواب دیا— "وہ چوہدریوں کا بیٹا آصف تھا"۔

"شاہدہ نے تم کو کچھ کہا تھا؟"

"نہیں جی!"— اس نے جواب دیا— "بی بی شاہدہ اندر چلی گئی تھی اور میں اپنا کام کر کے وہاں سے آگئی"۔

مجھ کو اچانک اس آصف پر غصہ آگیا۔ میں نے اپنے آپ کو کہا کہ ان لوگوں نے کیا ڈرامہ بنایا ہُوا ہے۔ میں نے بھنگن کو بھیج دیا اور شاہدہ کو اندر بلایا جو تھوڑی ہی دیر پہلے تھانے پہنچی تھی۔

"شاہدہ!"— میں نے اپنے غصے پر قابو پا کر کہا— "یہ بتاؤ کہ اس آصف کے ساتھ تمہارا کیا چکر چل رہا ہے۔ یہ سوچ لو کہ تم نے ذرا سا بھی جھوٹ بولا

تو اتنی بے عزتی کروں گا کہ سارا شہر تم پر لعنت بھیجے گا"۔

"نہ جی!"— اُس نے بڑی معصومیت سے کہا— "کوئی چکر نہیں۔ آصف کے ساتھ میرا کیا تعلق ہو سکتا ہے؟"

"ہو سکتا ہے نہ کہو"— میں نے تھانیداروں کے لہجے میں کہا— "تمہارا تعلق ہے اور ناجائز تعلق ہے اور اس تعلق کا نتیجہ یہ بچّہ تھا جو خدا نے تم سے واپس لے لیا۔ اب آگے بکواس کرو۔ یہ بتاؤ کہ تمہارے بچّے کو کس نے مارا ہے۔ اگر اب تم نے انوری کا نام لیا تو الٹا لٹکا دوں گا"۔

"آپ شریفوں کی بیٹی پر جھُوٹا الزام لگا رہے ہیں"— اس نے کہا۔

میں باہر نکلا اور ایک ہیڈ کانسٹیبل کو بلا کر کہا کہ آصف کو تھانے میں فوراً حاضر کرو۔

"اُس روز کی بات کرو"— میں نے اندر جا کر شاہدہ کو کہا— "جس روز تمہارا بچّہ مرا تھا آصف اور تم ڈیوڑھی میں کیا کر رہے تھے اور آصف بھنگن کو دیکھ کر دروازے کے پیچھے چھُپ کیوں گیا تھا؟"

میں یہ دیکھ کر حیران ہُوا کہ اتنی کم عمر لڑکی ذرا سا بھی نہ ڈری اور انکار ہی کرتی رہی۔ میرے اس سوال کا اس نے یہ جواب دیا کہ وہ چوہدری لہراسب سے ملنے آیا تھا اور میں پسند نہیں کرتی تھی کہ وہ چوہدری کی غیر حاضری میں اندر آئے۔

"بات دراصل یہ ہوئی ہے شاہدہ!"— میں نے کہا— "تم نے اور آصف نے مل کر بچّے کو مارا ہے جس کی وجہ یہ تھی کہ چوہدری کو پتہ چل گیا تھا کہ یہ بچّہ اس کا نہیں"۔

شاہدہ نے بلبلانا اور رونا شروع کر دیا۔ وہ اس الزام سے انکاری تھی۔ میں نے یہ جان لیا کہ یہ لڑکی بہت سخت ڈھیٹ مٹی کی بنی ہوئی ہے۔ اس کے پاس

کوئی جواب نہیں ہوتا تھا تو وہ یہ کہہ دیتی تھی کہ آپ انوری کو کیوں نہیں پکڑتے۔ وہ جب بھی انوری کا نام لیتی تھی تو میرے منہ سے ایک بکواس نکل جاتی تھی۔ دو مرتبہ اس نے مجھ کو اس طرح رام کرنے کی کوشش کی کہ اونچا اونچا رونا شروع کر دیا اور اس کے ساتھ یہ کہتی جاتی تھی کہ میرا معصوم بچّہ مارا گیا ہے اور آپ کے دل میں ذرا سا بھی رحم ترس نہیں آتا۔

ہم دونوں میں کھینچا تانی جاری تھی کہ مجھ کو ہیڈ کانسٹیبل نے بتایا کہ آصف آگیا ہے۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل کو کہا کہ وہ شاہدہ کو ساتھ لے جائے اور اپنی نگرانی میں بٹھائے اور آصف کو اندر بھیج دے۔

جب آصف میرے دفتر میں آیا تو میں نے اٹھ کر دروازہ بند کر دیا اور گھوم کر آصف کا گریبان پکڑ لیا۔

"غور سے سُن"—— "میں نے پولیس والوں کی مرغوب گالی دے کر کہا —— "اگر تُو نے یہ کہا کہ شاہدہ کے ساتھ تمہاری دوستی ناجائز نہیں تو یہاں سے تم کو سٹریچر پر اٹھا کر لے جائیں گے"—— میں نے اُس کو زور سے دھکا دیا تو وہ دیوار کے ساتھ جا لگا۔ میں نے کہا—— "تیری یہ ماں شاہدہ سچّی کہانی بک چکی ہے"۔

"بتاتا ہوں جناب' بتاتا ہوں"—— اُس نے ہکلا کر کہا—— "یہ سلوک تو نہ کریں"۔

آپ ایک بات نوٹ کریں کہ جس طرح کہا جاتا ہے کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے اسی طرح یہ بھی صحیح ہے کہ گنہگار کا ذرا سا بھی حوصلہ اور ذرا سی بھی جرأت نہیں ہوتی۔ اتنا خوبصورت جوان صاف پتہ لگ رہا تھا کہ اندر باہر سے کانپ رہا ہے اور پھر اس نے اپنے گناہ کو تسلیم کرنے میں ایک منٹ کی دیر بھی نہیں لگائی۔ میں آپ کو لمبی بات کیا سناؤں' اُس نے یہ بھی بتا دیا کہ یہ بچّہ

اُسی کا ہے اور اس بچے کی فرمائش شاہدہ نے کی تھی۔ میں شاہدہ کی یہ خواہش آپ کو اختر کی زبانی سنا چکا ہوں۔

آصف کے ساتھ جب مزید بات چیت ہوئی تو مجھ کو پتہ لگا کہ یہ تو تجربہ کار فراڈیا ہے۔ بڑی اچھی گفتگو کرتا ہے۔ اس نے یہ بھی بتا دیا کہ چوہدری لہراسب کے ساتھ اس نے اسی مطلب کے واسطے دوستی لگائی تھی۔ لہراسب بھی ہوشیار اور چالاک آدمی تھا اور اس کا رعب داب بھی تھا لیکن آصف نے اس پر اپنی زبان کا اور ایکٹنگ کا جادو چلا لیا تھا۔

"اب یہ بتاؤ کہ یہ حرام بچّہ مرا کس طرح ہے؟"—— میں نے پوچھا۔

اُس نے ہاتھ جوڑ جوڑ کر اور قسمیں کھا کھا کر انکار کرنا شروع کر دیا۔ یہ تو میں جانتا تھا کہ بچّے کو اس نے نہیں مارا۔ اس نے اور شاہدہ نے چوہدری لہراسب پر قبضہ کرنے کے واسطے تو بچّہ پیدا کیا تھا۔

یہ تو پتہ لگ گیا کہ بچّہ چوہدری لہراسب کا نہیں تھا' لیکن اصل مسئلہ تو اسی طرح موجود تھا کہ بچے کا قاتل کون ہے۔ میں پہلے ہی غصے میں تھا۔ میرا خیال لہراسب کی طرف چلا گیا۔ میرا غصہ اور بڑھ گیا۔ وہ اس واسطے کہ یہ لوگ روپے پیسے اور زمین جائیداد کے نشے میں اپنے آپ کو خدا کے برابر سمجھ لیتے ہیں۔ ایک بیوی سے بچّہ نہ ہو تو ایک اور خرید کر لے آتے ہیں۔ یہ بھی نہیں دیکھتے کہ شریفوں کی بیٹی کو اُجاڑ رہے ہیں اور پھر یہ بھی نہیں دیکھتے کہ اپنے گھر میں درپردہ کیا کیا ڈرامے چل رہے ہیں۔ میں نے اسی غصے میں ایک کانسٹیبل کو کہا کہ وہ چوہدری لہراسب کو لے آئے۔ میں اس دوران آصف کے ساتھ باتیں کرتا اور سوال پوچھتا رہا۔

حوالات میں طلاق

کچھ دیر بعد لہراسب آگیا۔ میں اس وقت آصف کو فارغ کر چکا تھا اور دفتر میں اکیلا بیٹھا اسی واردات کی بابت سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا۔

"چوہدری لہراسب!"—— میں نے کہا—— "تم ہی کچھ بتاؤ کہ کون سا ایسا شیر دلیر ہے جو دن کے وقت تمہارے گھر میں آکر تمہارے بچّے کو ہمیشہ کی نیند سلا گیا ہے"۔

میں لہراسب کے منہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر میں چُپ ہو گیا اور میرا غصہ ٹھنڈا ہونا شروع ہو گیا۔ میں بتا چکا ہوں کہ ایک آدمی نے مجھ کو بتایا تھا کہ لہراسب دماغی طور پر ٹھیک نہیں رہا۔ میں نے لہراسب کو اس سے زیادہ بُری حالت میں دیکھا جو مجھ کو بتائی گئی تھی۔ اس کی آنکھیں آدھی کھُلی ہوئی تھیں اور اس کا سر ڈول رہا تھا۔ میں تو اس پر سارا غصہ نکال دینے پر تُلا ہُوا تھا لیکن اُس کی حالت دیکھ کر میرے خیالات بدل گئے۔ اس کی حالت ایسی ہو رہی تھی جیسے اس کو احساس ہی نہیں کہ وہ تھانے میں تھانیدار کے سامنے بیٹھا ہوا ہے اور تھانیدار قتل کے کیس کی تفتیش کر رہا ہے۔

"کوئی بات کرو چوہدری!"—— میں نے نرم لہجے میں کہا—— "میں تمہارے دُکھ اور درد کو جانتا ہوں اور اب اس بات کی تصدیق ہو گئی ہے کہ یہ بچّہ تمہارا نہیں تھا"۔

"تصدیق کس نے کی ہے؟"—— اُس نے ایسے لہجے میں کہا جیسے نیند میں بول رہا ہو۔

"ڈاکٹر نے"—— میں نے کہا—— "سول ہسپتال کے ڈاکٹر منوہر کپور نے مجھ کو ساری بات سنائی ہے۔ تم نے تو جھوٹ بولا تھا کہ تم اپنا ڈاکٹری معائنہ کرا

چکے ہو اور ٹھیک ٹھاک ہو، لیکن اب...."

مجھ کو آج وہ وقت اس طرح یاد ہے جس طرح اب بھی لہراسب میرے سامنے بیٹھا ہُوا ہو اور میں اس کو دیکھ رہا ہوں۔ اُس کا سر اس طرح جُھک گیا جیسے وہ اونگھتے اونگھتے سو گیا ہو یا اس پر غشی طاری ہو گئی ہو۔ میں فوراً اٹھا اور اس کے پیچھے جا کر ہاتھ آگے کئے اور اس کی ٹھوڑی ہاتھوں سے اوپر اٹھا کر دیکھا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے۔ میں نے اُس سے پوچھا، کیا ہُوا ہے چوہدری؟ اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ اپنی کرسی پر بیٹھ جاؤ۔ میں اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے سر اوپر کر کے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔

"اس بچّے کو میں نے قتل کیا ہے"—— لہراسب نے کہا۔ یکلخت اُس کی آواز اونچی ہو گئی اور اس نے میز پر ہاتھ مار کر کہا—— "اللہ پاک کی قسم! حرام کے اس بچّے کو میں نے قتل کیا ہے"—— اس کی آواز اور اونچی ہو گئی۔ وہ کہہ رہا تھا—— "میں نے .... میں نے .... محبوب بھائی! اس کو میں نے قتل کیا ہے"—— اس کے ساتھ ہی وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

میں اُٹھ کر پھر اس کے پاس گیا اور اس کا سر اپنے ساتھ لگا لیا۔

"ہوش کرو چوہدری!"—— میں نے بڑے پیار سے کہا—— "ہوش میں آؤ۔ تم نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ تم نے سچ بولا ہے۔ خدا تمہیں سچ کا اجر دے گا"۔

"محبوب عالم صاحب!"—— اُس نے بڑا لمبا سانس لیا جیسے بڑی لمبی مسافت کا مسافر منزل پر پہنچ گیا ہو اور بولا—— "مجھ سے زیادہ بد قسمت اور کون ہو گا۔ انوری جیسی بیوی میرے منہ پر تھوک کر اپنے گھر چلی گئی اور میرے گھر میں ایک بدکار لڑکی آئی اور میرے اس گھر میں جس کو سب عزت کی نظر سے دیکھتے تھے، حرام کا بچّہ پیدا کیا.... اور پھر بھائی محبوب! اتنے معصوم بچّے کو مار کر کیا

آپ چین سے رہ سکیں گے؟.... اللہ.... اللہ.... میں تو اس ظلم کے بعد سویا نہیں"— وہ چُپ ہو گیا اور ویسے ہی اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ یکلخت بم کی طرح پھٹا— "میں پاگل ہو جاؤں گا محبوب! میں پاگل ہو جاؤں گا میں نے بچّے کے منہ اور ناک پر تکیہ رکھ کر دبایا تو اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ اور پاؤں بڑی زور زور سے ہلے اور پھر ایک منٹ بھی نہیں لگا کہ یہ ننھے منھے ہاتھ پاؤں بے جان ہو گئے.... مجھ کو فوراً" پھانسی کے تختے پر کھڑا کر دو"۔

میرے واسطے اس شخص کی یہ حالت سنبھالنی ناممکن نظر آتی تھی۔ تھانیدار اتنے جذباتی نہیں ہُوا کرتے' لیکن اس شخص نے میرے جذبات کو ہلا کر رکھ دیا۔ میں نے اس کا بیان بھی لینا تھا۔ بڑی ہی مشکل سے اس کا اقبالی بیان لیا لیکن میں نے یہ دیکھا کہ جوں جوں وہ بیان دیتا چلا جاتا تھا اس کی ذہنی حالت سنبھلتی چلی جاتی تھی۔ میں اس پر تبصرہ نہیں کرنا چاہتا۔ آپ نے ساری کہانی پڑھی ہے۔ اگر آپ اس کی جگہ ہوتے تو تصوّر میں لائیں کہ آپ کا کیا حال ہوتا۔

اس کا پورا بیان دینے کی ضرورت نہیں۔ میں نے کہانی ساری سنا دی ہے۔ میں جب اس کو حوالات میں بند کرنے لگا تو اس نے التجا کی کہ وہ اپنی بیوی شاہدہ سے ملنا چاہتا ہے۔ اتفاق سے شاہدہ وہیں تھی۔ میں نے لہراسب کو کہا کہ میں شاہدہ کو بلاتا ہوں۔ اُس نے کاغذ مانگا اور میز کے ساتھ کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے اس کو کاغذ دیا اور یہ سوچ کر اپنا پین بھی اس کو دے دیا کہ وہ شاید کچھ لکھنا چاہتا ہے۔ اس نے لکھا اور کاغذ مجھ کو دیا۔ میں نے تحریر پڑھی۔ یہ طلاق نامہ تھا جو اس نے شاہدہ کے نام لکھا تھا یعنی اس نے شاہدہ کو طلاق دے دی۔ اس نے مجھ کو کہا کہ میں بھی اس پر گواہی ڈال دوں اور یہ شاہدہ کو دے دوں اور اُس کو اس کے سامنے نہ لاؤں۔

میں نے یہ طلاق نامہ شاہدہ کو دے دیا اور اس کو بتایا کہ تمہاری چھُٹی ہو گئی ہے۔ میں اس کے پاس زیادہ نہیں ٹھہرا اس واسطے کہ ملزم اکیلا بیٹھا تھا۔ میں نے اپنے دفتر میں آکر لہراسب کو ساتھ لیا اور حوالات میں بند کر دیا۔ اُس وقت اس نے کہا کہ انوری اگر میرے اوپر رحم کرے تو تھوڑی سی دیر کے واسطے آ جائے۔ اس نے یہ درخواست ایسے لہجے میں کی کہ میں نے انوری کو بلوایا۔ انوری آئی تو میں نے اس کو بتایا کہ بچے کو لہراسب نے خود قتل کیا ہے اور اس نے اقبالی بیان دے دیا ہے اور اس نے یہ بھی مان لیا ہے کہ یہ بچّہ اُس کا نہیں تھا۔

انوری کی جو حالت ہوئی وہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ مجھ کو تو ڈر تھا کہ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑے گی۔ اس کا باپ اس کے ساتھ تھا۔ اُس نے اور میں نے اس کو سنبھالا۔ وہ ذرا سنبھلی تو میں اس کو حوالات کے دروازے کے سامنے لے گیا۔ تب میں نے محسوس کیا کہ انوری کے دل میں لہراسب کی کتنی زیادہ محبت تھی۔ لہراسب سلاخوں کے پیچھے تھا۔ انوری نے اپنے دونوں ہاتھ اندر کر کے اس کے دونوں ہاتھ پکڑے اور ہاتھ باہر کر کے انہیں چُومنے لگی اور کئی بار اس نے لہراسب کے ہاتھوں کو اپنی آنکھوں سے لگایا۔

"انوری!"— لہراسب نے رندھی ہوئی آواز میں کہا— "مجھ کو بخش دینا۔ میں نے تمہاری قدر نہیں کی۔ اگر چاہو تو میں تم کو طلاق دے دوں گا"۔

"اس سے آگے نہ بولنا چوہدری!"— انوری نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کر کہا— "پھانسی چڑھ جاؤ گے تو بھی خدا کی قسم' شادی نہیں کروں گی۔ عمر قید ملی تو تمہارے انتظار میں بیٹھی رہوں گی.... لیکن چوہدری' میرا دل گواہی دیتا ہے کہ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ میری طرف سے بے غم رہنا"۔

انوری چلی گئی۔

اس کے بعد جو کارروائی شروع ہوئی وہ مقدمے کی تیاری اور مقدمے کی پیشیاں تھیں۔ لہراسب نے مجسٹریٹ کو بھی بیان قلمبند کروا دیا تھا۔ ایک ہندو وکیل انوری کے باپ نے کیا تھا۔ سیشن کورٹ میں اس وکیل کے کہنے پر لہراسب اپنے اقبالی بیان سے منحرف ہو گیا پھر بھی سیشن جج نے اس کو عمر قید سنا دی۔ اسی ہندو وکیل نے اپیل دائر کی اور صرف اس نکتے پر لہراسب کو بری کروا لیا کہ موقعہ کا کوئی گواہ نہیں اور صرف اقبالی بیان پر مقدمہ کھڑا کیا گیا تھا اور یہ اقبالی بیان بھی مشکوک ہے۔

سات آٹھ مہینوں بعد لہراسب گھر آگیا اور پھر مجھ کو یہ پتہ چلا کہ انوری اس کے گھر پہنچ گئی ہے۔

میں خوش تھا کہ یہ قصہ یہیں پر ختم ہو گیا ہے اور مجھ کو یہ بھی خوشی تھی کہ لہراسب بری ہو کر آگیا ہے' لیکن تین ہی مہینے گزرے تھے کہ اس کہانی کا دوسرا حصہ شروع ہو گیا جو اس سے زیادہ خوفناک تھا۔

لہراسب معزز اور بھلا آدمی تھا۔ مجھ کو غصہ اس کی دوسری بیوی پر تھا جو لہراسب کے خاندانی وقار کے بالکل اُلٹ تھی۔ ایک روز لہراسب مجھ کو ملنے کے واسطے تھانے میں آیا۔ وہ میرا شکریہ ادا کرتا تھا کہ میں نے اس کی بہت مدد کی تھی حالانکہ میں نے اس کی کوئی مدد نہیں کی تھی۔ صرف یہ بات تھی کہ میری ساری ہمدردی اُس کے ساتھ تھی اور میں نے تھانے میں بھی اس کی پوری پوری عزت کی تھی۔ ہاں اگر میں نے اس کی کوئی مدد کی تھی تو وہ یہ تھی کہ خانہ پُری جس کو پولیس کی زبان میں "پیڈنگ" کہتے ہیں' وہ نہیں کی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپیل میں بری ہو گیا تھا۔ پولیس کے واسطے پیڈنگ کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہوتا۔ تھانیدار بڑے مزے سے کورٹ میں موقعہ کا گواہ بھی پیش کر

دیا کرتے ہیں۔

لہراسب کے ساتھ گپ شپ ہوتی رہی۔ وہ بہت افسوس کا اظہار کرتا تھا کہ اس نے اپنی پہلی بیوی کو بہت پریشانی دی' لیکن خوشی کا اظہار بھی کرتا تھا کہ ایسی بیوی کسی کسی کو ملتی ہے' جو خاوند کے پیچھے اپنی جوانی اور اپنی زندگی قربان کر دیتی ہے۔ اس کی پہلی بیوی انوری نے اس کو کہا تھا کہ تم کو اگر عمر قید ہو گئی تو میں تمہاری واپسی تک تمہارا انتظار کروں گی۔

"محبوب صاحب!"—— لہراسب نے کہا—— "آصف جیسے بندے کو تو زندہ نہیں چھوڑنا چاہیے۔ مجھ کو اس شخص پر بہت غصہ ہے۔ اس نے میری دوسری بیوی کے ساتھ تعلقات جوڑ کر میرے گھر کو ناپاک کیا تھا۔ اس کو دیکھتا ہوں تو میرا خون جوش مارنے لگتا ہے۔ پھر سوچتا ہوں کہ شاہدہ اب تو میری بیوی نہیں رہی"۔

"دفع کرو چوہدری لہراسب!"—— میں نے کہا—— "تم عزت دار آدمی ہو' ایک بدکار بیوی کو طلاق دے کر تم نے اپنی عزت بچا لی ہے۔ لوگ تو اُسی کو بُرا کہتے ہیں"۔

میں نے یہ نوٹ کیا تھا کہ یہ شخص' لہراسب' ذہنی طور پر کچھ کچھ اُکھڑا ہُوا تھا۔ ایک تو اس واسطے کہ اس نے جیل بھی دیکھ لی تھی اور بڑا گندہ مقدمہ بھگتا تھا اور پھر اس کو آصف اور دوسری بیوی پر غصہ بھی تھا۔ میں نے اس کو سمجھایا بجھایا اور کہا کہ اولاد دے نہ دے' یہ اللہ ہے جو پتھر سے بھی پانی نکال دیتا ہے۔

کچھ دیر بعد گپ شپ لگا کر وہ چلا گیا۔ اس کے بعد بھی اس کے ساتھ ایک ملاقات ہوئی تھی۔

اس کے بری ہونے کے تین مہینے بعد کا واقعہ ہے۔ صبح سویرے سویرے لہراسب کی دوسری بیوی شاہدہ کے گاؤں کا نمبردار دو آدمیوں کو ساتھ لے کر

میرے گھر آیا۔ میں ابھی تھانے جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا۔ نمبردار نے بتایا کہ اس کے گاؤں سے تھوڑی دور فصل میں ایک لاش پڑی ہوئی ہے۔ خون اور زخموں سے پتہ لگتا ہے کہ اس کو کلہاڑی یا چھوّی سے مارا گیا ہے۔

"یہ نہیں پتہ وہ کون تھا؟"— میں نے پوچھا

"لاش اوندھے منہ پڑی ہے"— نمبردار نے جواب دیا— "سر کے زخموں سے خون بہہ بہہ کر اس کے چہرے پر جما ہُوا ہے اس واسطے لاش شناخت نہیں ہوئی۔ میں نے اطلاع ملتے ہی دو آدمیوں کو وہاں پہرے پر کھڑا کر دیا ہے کہ کوئی قریب نہ جائے"۔

جو دو آدمی نمبردار کے ساتھ آئے تھے' انہوں نے لاش دیکھی تھی۔ چونکہ اس نمبردار کا گاؤں قریب تھا اس واسطے یہ دونوں اس گاؤں میں چلے گئے۔ ان کے بیان کے مطابق یہ صاف طور پر قتل کا کیس تھا۔ اس کیس کی تفتیش میں نے اپنے ذمّے لے لی۔ میرا جونیئر سب انسپکٹر اور اے ایس آئی پہلے ہی بہت مصروف تھے۔ میں نے ضروری کاغذی کارروائی کی اور ان کے ساتھ چلا گیا۔ وہ جگہ جہاں لاش پڑی تھی قصبے سے کچھ دُور اور گاؤں سے تقریباً" دو فرلانگ دور تھی۔ یہ گاؤں قصبے سے جس کو شہر کہا جاتا تھا' کوئی ایک میل دور تھا۔

نمبردار نے یہ عقلمندی کی تھی کہ موقعہ پر جلدی پہنچ گیا تھا۔ ان معاملات کو وہ جانتا تھا اس واسطے اُس نے کھرے بچانے کے واسطے آدمی پہرے پر کھڑے کر دیئے تھے۔ لاش کے اِردگرِد فصل ٹوٹی ہوئی تھی جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ یہاں لڑائی اور ہاتھاپائی ہوئی ہے۔ لاش کے قریب ایک چاقو پڑا ہُوا تھا جس کا پھل تقریباً" چھ انچ تھا۔ یہ مقتول کا معلوم ہوتا تھا۔

میں نے کھوجی کو پیغام بھیج دیا کہ وہ فلاں جگہ آجائے۔ میں نے لاش کو

سیدھا کیا۔ اس کے منہ پر دائیں اور بائیں خون جما ہُوا تھا پھر بھی لاش کی شناخت میں مجھ کو کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ وہ آصف کی لاش تھی۔

آصف شہر کا رہنے والا وہی جوان تھا جس کا پہلے بہت ذکر آچکا ہے۔ اس کے شاہدہ کے ساتھ تعلقات تھے اور شاہدہ نے جس بچے کو جنم دیا تھا وہ اسی کا تھا۔

سب سے پہلے میرا دھیان لہراسب کی طرف گیا۔ میں نے اوپر بیان کیا ہے کہ لہراسب بری ہو کر مجھ کو تھانے میں ملنے آیا تھا تو اُس نے آصف کے خلاف غصے کا اظہار کیا تھا۔ میں نے بتایا ہے کہ لہراسب معزّز اور پروقار آدمی تھا۔ اُس کا یہ مطلب نہیں کہ بے غیرت اور بزدل تھا۔ یہ لوگ تو معمولی سی بات پر بندے کو قتل کر دیا کرتے تھے۔ آصف نے اس کی بیوی کے ساتھ غلط تعلق جوڑا ہُوا تھا جس کے نتیجے میں ناجائز بچّہ پیدا ہُوا تھا۔ بے شک شاہدہ اب لہراسب کی بیوی نہیں تھی' لیکن لہراسب کی بے عزتی جو ہوئی تھی وہ اس درجے کے لوگ معاف نہیں کیا کرتے تھے۔

مجھ کو یہ خیال بھی آیا کہ ہو سکتا ہے آصف نے شہر میں کہیں بیٹھ کر اس قسم کی باتیں کی ہوں کہ اس نے لہراسب کی بیوی سے بچّہ پیدا کیا تھا۔ آصف جیسے اوچھے آدمی اس طرح کی بات کر دیا کرتے ہیں۔ البتہ سوچنے والی بات یہ تھی کہ شہر سے اتنی دُور یہ واردات کیوں کی گئی۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ قتل لہراسب نے خود نہیں کیا بلکہ اپنے کسی نوکر یا مزارعہ یا کرائے کے کسی قاتل سے کروایا ہو گا۔

یہ تو تفتیش کی باتیں ہیں جو میں بعد میں کروں گا۔ وہاں میں نے پہلی کارروائی یہ کی کہ لاش کا نظری معائنہ کیا۔ اس کو دو کلہاڑیاں سر پر لگی تھیں۔ ایک زخم گردن پر تھا اور ایک زخم سینے پر تھا۔ یہاں کلہاڑی اُس وقت ماری گئی

ہو گی جب مقتول گر پڑا ہو گا۔ میرا اندازہ یہ تھا کہ چار پانچ پسلیاں کٹ گئیں ہیں۔ اس کے بعد مقتول تڑپتے تڑپتے پیٹ کے بل ہو گیا اور مر گیا۔

نمبردار کو اپنی ڈیوٹی کا پتہ تھا۔ اس نے چارپائی منگوا لی تھی۔ لاش کی برآمدگی کے کاغذات تیار کر کے لاش پوسٹ مارٹم کے واسطے قصبے کے ہسپتال میں بھجوائی اور میں واپس تھانے آگیا۔ آصف کے گھر اطلاع بھجوائی کہ وہ قتل ہو گیا ہے اور وہ تھانے آئیں۔

لہراسب کا خاص آدمی

آصف کے خاندان کے بے شمار لوگ بچے' بوڑھے عورتیں روتے چیختے تھانے میں آگئے۔ میں نے ان کو ہسپتال بھیج دیا اور کہا کہ وہاں وہ لاش کو دیکھ کر میرے پاس آجائیں۔ اس طرح لاش کی شناخت آصف کے باپ اور اس کے ایک بھائی سے کروائی۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ تو مجھ کو معلوم تھا کہ کیا آئے گی۔ میں نے صرف یہ دیکھنا تھا کہ واردات کتنے بجے ہوئی۔ ڈاکٹر نے جو موت کا وقت لکھا تھا وہ رات نو بجے کے لگ بھگ تھا۔ دیہات میں نو بجے کو لوگ آدھی رات سمجھا کرتے تھے۔ سارے دن کے تھکے ہوئے لوگ سورج غروب ہوتے ہی کھانا کھا لیتے اور سوجاتے تھے اور صبح اس وقت جاگتے تھے جب ابھی اندھیرا ہُوا کرتا تھا۔

میں نے آصف کے باپ اور بھائی کو تھانے بلایا۔ پہلے باپ سے پھر بھائی سے پوچھ گچھ کی۔ ان سے میں نے پوچھا کہ ان کی خاندانی یا ذاتی دشمنی کسی کے ساتھ تھی؟ دونوں نے بتایا کہ ان کی خاندانی دشمنی کسی کے ساتھ بھی نہیں۔ پھر ان سے پوچھا کہ آصف کی ذاتی دشمنی کسی کے ساتھ تھی؟ باپ نے ذرا سنبھل کر بات کی۔ میں جان گیا کہ وہ بیٹے پر پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن اس

کے بھائی نے کوئی پردہ نہ رکھا۔

"صاف بات ہے جناب!" — مقتول کے بھائی نے کہا — "مجھ کو خطرہ نظر آرہا تھا کہ میرا بھائی ایک نہ ایک دن اسی انجام کو پہنچے گا۔ اس کا تو یہ حال تھا کہ گھر کو ہوٹل سمجھتا تھا۔ جہاں ایک کمرہ بک ہوتا ہے اُس میں چاہے رہو یا نہ رہو۔ اس کی شادی کر دی تھی کہ راہِ راست پر آجائے گا' لیکن اس نے بیوی کو گھر میں قید کر دیا اور خود پہلے سے زیادہ آوارہ ہو گیا۔ ایک بچّہ پیدا ہُوا تو اس کی طرف بھی اس کی توجہ نہیں آئی۔ بیوی بے چاری صبر شکر کرنے والی لڑکی ہے اس واسطے برداشت کر رہی تھی"۔

"کرتا کیا تھا؟" — میں نے پوچھا — "میرا مطلب ہے کہ کس قسم کی بدمعاشیاں کرتا تھا؟"

"اس کی ایک بدمعاشی تو آپ نے خود ثابت کی ہے" — اس نے جواب دیا — "چوہدری لہراسب جیسے بڑے زمیندار اور اثرو رسوخ والے آدمی کے گھر جا کر اس نے یارانہ لگایا۔ بس اسی قسم کی اس کی حرکتیں تھیں۔ جُوأ یہ کھیلتا تھا۔ اس کے یار دوست بھی ایسے ہی ہیں"۔

"کیا تم یہ کہنا چاہو گے کہ چوہدری نے اس کو قتل کروایا ہے؟" — میں نے پوچھا۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں جناب!" — اس نے جواب دیا — "مجھ کو یہ شک ہے کہ میرے اس بھائی نے کسی اور جگہ ایسی ہی یاری لگائی ہو گی اور رگڑا گیا۔ چوہدری لہراسب پر بھی شک ہے۔ یہ تو آپ کا کام ہے کہ معلوم کریں کہ اصل مجرم کون ہے"۔

"کیا تم بتا سکتے ہو کہ اس کی یاری اور کن عورتوں کے ساتھ تھی؟" — میں نے پوچھا۔

اس نے دو عورتوں کے نام لیے۔ ان کے گھروں کے پتے بھی دیے جو میں نے نوٹ کر لیے۔ اس سے پوچھ کر آصف کے دو تین گہرے دوستوں کے نام بھی لکھ لیے۔ میرا دراصل دھیان لہراسب کی طرف تھا۔ قتل کی ہمت وہی رکھتا تھا اور اس کے پاس قتل کی وجہ بھی تھی۔ لہراسب کو فوراً تھانے بلانا ضروری تھا۔ مقتول کے بھائی اور باپ کو اس وقت رخصت کرنا بھی ضروری تھا کہ ان بے چاروں نے مقتول کے کفن دفن کا انتظام کرنا تھا اور ویسے بھی وہ بہت غمزدہ تھے۔ میں نے ان دونوں کو جانے دیا اور ایک کانسٹیبل کو بھیجا کہ وہ لہراسب کو ساتھ لے آئے۔

لہراسب آیا۔ وہ بالکل نارمل بلکہ اچھے مُوڈ میں تھا۔

"محبوب صاحب!" — اُس نے بڑے خوشگوار لہجے میں کہا — "مجھ کو پہلے ہی انتظار تھا کہ آپ سب سے پہلے مجھ کو ہی بلائیں گے۔ سب سے پہلا شک میرے اوپر ہی ہونا چاہیے .... سچّی یہ بات ہے کہ میں خوش ہوں کہ جو کام مجھ کو کرنا چاہیے تھا وہ کسی اور نے کر دیا۔"

"چوہدری لہراسب!" — میں نے بڑے سنجیدہ لہجے میں کہا — "تم نے خود ہی کہہ دیا ہے کہ پہلا شک تم پر کیا جائے گا۔ تم نے ٹھیک ہی سوچا ہے اور سچّی بات یہ ہے کہ اس شخص کو تمہارے ہی ہاتھوں قتل ہونا چاہیے .... میں تمہارے ساتھ دوستوں کی طرح بات کرنا چاہتا ہوں۔ تمہاری طرح میں بھی خوش ہوں کہ ایک بدکار آدمی کو صحیح سزا ملی۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ تمہارے کیس میں میری ہمدردی تمہارے ساتھ رہی ہے۔ اب تو تم نے میرے دل میں اپنی محبت بھی پیدا کر لی ہے۔ میں اس محبت کی قیمت دوں گا۔ میں کہتا ہوں کہ آصف کو تم نے قتل کیا ہے۔ اب تم ثابت کرو کہ تم نے قتل نہیں کیا۔"

"میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں" — لہراسب نے کہا — "وہ گزشتہ رات

قتل ہُوا ہے اور میں کل شام سے لے کر صبح سورج نکلنے تک گھر سے باہر نہیں نکلا۔"

"قتل تم نے نہیں کیا" — میں نے کہا — "تم نے قتل کروایا ہے۔ جیب میں پیسہ ہونا چاہیے۔ کرائے کے قاتلوں کی کمی تو نہیں۔ سیدھی بات کرو۔ مجھ کو صحیح بات بتا دو۔ پردہ ڈالنا میرا کام ہے۔ میں تم سے رشوت نہیں مانگتا۔ مقتول کا بھائی بتا گیا ہے کہ مقتول ایسا بدکار تھا کہ اس کا یہی انجام ہونا تھا۔ میں ایسے بُرے آدمی کے قتل پر ایک اچھے اور عزت والے آدمی کو پھانسی نہیں چڑھنے دوں گا۔ تم بات کرو۔"

"محبوب صاحب!" — اُس نے کہا — "اگر یہ کام میں نے کیا یا کروایا ہوتا تو سب سے پہلے آپ کی خدمت میں نقد نذرانہ پیش کرتا اور کہتا کہ اس کیس کو گول کر دو اور میں آپ کو اتنی رشوت پیش کرتا کہ آپ بھی حیران رہ جاتے۔ اگر میں نے اس شخص کو قتل کروانا ہوتا تو تین مہینے انتظار نہ کرتا۔ میرے واسطے یہ کام کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ اس شخص کی حیثیت ہی کیا تھی۔ ایسا سمجھ لیں کہ یہ شخص ہر وقت میرے تیر کے نشانے میں رہتا تھا۔ میں کسی بھی وقت تیر چلا سکتا تھا۔ شہر سے اتنی دُور جا کر اس کو قتل کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے اس کو دل سے اتار دیا تھا۔ یہ تو سوچا ہی نہیں تھا کہ کس وقت وہ کہاں جاتا ہے .... آپ تفتیش کریں۔ مخبر آپ کے پاس ہیں۔ ویسے بھی آپ کے ہاتھ بڑے لمبے ہیں اور آپ میں عقل بھی ہے۔"

"میں تفتیش تو کر ہی رہا ہوں" — میں نے کہا — "لیکن چوہدری لہراسب! میں تمہیں تکلیف تو نہیں دینا چاہتا' لیکن پولیس کے دستور کے مطابق میں مجبور ہوں کہ آج رات یا جب تک تمہارے خلاف یہ شک صاف نہیں ہو جاتا تمہیں تھانے میں ہی رہنا پڑے گا .... گھبراؤ نہیں۔ حوالات میں

نہیں رکھوں گا۔ بڑی عزت سے مہمان بنا کر رکھوں گا۔ تم چاہو تو کھانا گھر سے منگوا سکتے ہو نہیں تو میں تمہیں بڑا اچھا کھانا کھلاؤں گا"۔

"آپ کا حکم سر آنکھوں پر جناب!"

سورج غروب ہو چکا تھا' لیکن یہ قتل کا کیس تھا جس کی تفتیش کو میں اگلے دن پر نہیں ڈال سکتا تھا۔ تمام مُشتبہوں کو رات ہی رات اپنے قبضے میں لے لینا بہت ضروری تھا۔ اگر اس قسم کی تفتیش میں وقت ضائع کر دیا جائے تو ملزم اِدھر اُدھر ہو جاتے ہیں یا اپنے بچاؤ کا بندوبست کر لیتے ہیں۔ میں نے لہراسب کو الگ کمرے میں بٹھا دیا اور اس کو بتائے بغیر یہ حکم جاری کر دیا کہ یہ شخص اس کمرے سے باہر نہ نکلے اور اس کو یہ پتہ نہ لگے کہ میں کس کس کو بلا رہا ہوں۔

میں نے اسی کے محلّے کے ایک معزّز فرد کو بلایا جو قصبے کا نمبردار بھی تھا۔ اس سے پوچھا کہ لہراسب کے نوکر اور مزارعے کتنے کچھ ہیں اور ان میں کوئی ایسا بھی ہے جو کرائے کا قاتل بننے کی ہمت رکھتا ہو؟ نمبردار نے وہی رائے دی جو میں پہلے دے چکا ہوں۔ وہ یہ کہ لہراسب اس حیثیت کا آدمی ہے جو سب کچھ کر بھی سکتا ہے اور کروا بھی سکتا ہے۔ بہرحال نمبردار نے ایک آدمی کا نام بتایا جو لہراسب کے خاص خاص کام کیا کرتا تھا' لیکن اس کا تنخواہ دار نوکر نہیں تھا اور اس کا مزارعہ بھی نہیں تھا۔ اخلاقی لحاظ سے وہ بدمعاش ٹائپ آدمی تھا اور اس کی شہرت کچھ اچھی نہیں تھی۔

"گھر میں اس کا نوکر ہے"___ نمبردار نے کہا___ "اس کا نام شرفو ہے۔ اس کی بابت میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ قتل جیسا جرم نہیں کر سکتا۔ اگر چوہدری لہراسب نے باہر کا کوئی آدمی اس کام کے واسطے بلایا ہو تو وہ میں نہیں بتا سکتا"۔

"ایک کام کرو"___ میں نے اس سے کہا___ "کسی طرح یہ معلوم کرو کہ

کل شام لہراسب کے گھر باہر کا کوئی آدمی مہمان کے طور پر تو نہیں آیا تھا؟ اگر آیا تھا تو وہ کون تھا اور کہاں کا رہنے والا تھا.... یہ بھی معلوم کرو کہ چوہدری لہراسب نے کسی محفل میں یا کسی کے ساتھ یہ بات کی ہو کہ وہ آصف سے اپنی بے عزتی کا انتقام لے گا یا آصف کے خلاف کبھی بات کی ہو"۔

"میرے ساتھ لہراسب کی اچھی بھلی دوستی ہے"___ نمبردار نے کہا___ "کئی بار اس کے ساتھ اس کے بچّے کے قتل کی بات ہوئی ہے۔ اس نے آصف کی بابت کبھی بات نہیں کی"۔

یہاں میں آپ کو نمبرداروں کی بابت بتاتا ہوں کہ ان لوگوں کا اپنا ایک جاسوسی کا انتظام ہوتا تھا۔ یہ لوگ پولیس کے زر خرید غلام ہوتے تھے۔ تھانیدار چھوٹا ہو یا بڑا' جُھک کر اس کو سلام کرتے تھے۔ ملزموں کو پکڑوانے میں بڑی محنت کرتے تھے لیکن کوئی نمبردار کسی ملزم کو بچانے کی ضرورت محسوس کرتا تو ایسے ایسے ڈرامے کھیلتا تھا کہ ملزم کو تھانے میں سے ہی چھڑا لیتا تھا۔ بعض وارداتیں یہ نمبردار خود کراتے تھے۔

اُس نمبردار پر بھی مجھ کو ایسا ہی شک ہُوا۔ اس کی اور لہراسب کی ذات برادری ایک ہی تھی۔ میں نے نمبردار کو ڈرایا اور کہا کہ اس کی ذرا سی بھی ہیرا پھیری ثابت ہو گئی تو میں اسی کو قاتل ثابت کر دوں گا۔

میں نے نمبردار کو مخبری کے واسطے کچھ باتیں بتائیں اور اس کو چھُٹی دے دی۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک کانسٹیبل کو اس آدمی کا نام اور گھر بتا کر بھیجا جو نمبردار نے بتایا تھا کہ لہراسب کا خاص آدمی ہے۔ کانسٹیبل کو کہا کہ اس آدمی کو تھانے لے آئے۔

شاہدہ کے واسطے ریشمی دوپٹہ

مجھ کو اچھی طرح یاد ہے کہ مارچ کے آخر کے دن تھے۔ سردی بہت کم ہو گئی تھی' لیکن لہراسب کا یہ خاص آدمی تھانے میں آیا تو اس نے اپنے اوپر کمبل لیا ہُوا تھا اور بہت آہستہ آہستہ چلتا تھا۔ میرے دفتر میں داخل ہُوا تو فرش پر اس طرح بیٹھ گیا جس طرح آدمی گر پڑتا ہے۔ اس نے کمبل سر پر بھی لیا ہوا تھا اور بیٹھ کر کمبل اور اوپر کر لیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں نے اس کو کیوں بلایا ہے۔ میں نے دوبارہ اس سے پوچھا کہ اس نے کیا کہا ہے۔ یہ میں نے اس واسطے پوچھا کہ وہ بہت آہستہ آہستہ بول رہا تھا اور شاید اس کو ٹھنڈ زیادہ لگ رہی تھی اس واسطے اس کے الفاظ سمجھ میں نہیں آئے تھے۔

"اونچی بات کرو" —— میں نے رعب دار آواز میں کہا —— "اور کمبل ماتھے سے پیچھے کرو"۔

"جناب!" —— اس نے ذرا اونچا بولنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا —— "آج چوتھا دن ہے' میں بخار میں پڑا ہوں۔ کوئی کہتا ہے بڑا بخار ہے اور کوئی باری کا بخار (ملیریا) بتاتا ہے۔ یہ تو حضور کا حکم پہنچا تو میں آ گیا۔ میں تو چار دن سے چارپائی سے اٹھ ہی نہیں سکا۔ کل رات حکیم کو گھر بلایا تھا"۔

اس نے ایک ہندو حکیم کا نام لیا۔ میں اس کو جانتا تھا۔ سیانا آدمی تھا۔ دیسی علاج کرتا تھا اور انگریزی علاج بھی کر لیتا تھا۔

"اُس کو کتنے بجے بلایا تھا؟"

"میرا خیال ہے رات آٹھ نو بجے کے درمیان کا کچھ وقت تھا" —— اُس نے جواب دیا —— "اللہ اُس کا بھلا کرے' ایک گھنٹہ میرے پاس بیٹھا رہا۔ کچھ چیزیں میرے گھر میں ہی رگڑ کر اس نے مجھ کو پلائیں"۔

میں نے اُس سے زیادہ کچھ پوچھنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ یہ اس واسطے کہ میں نے صبح ہی صبح اُس ہندو سیانے کو تھانے بلا کر معلوم کرنا تھا کہ وہ اس شخص کے گھر گیا تھا یا نہیں اور اگر گیا تھا تو کتنی دیر وہاں ٹھہرا تھا اور اگر یہ شخص مریض تھا تو اس کی حالت کیا تھی۔ یہ ہندو حکیم بوڑھا آدمی تھا۔ شہر میں اس کی شہرت بھی تھی۔ مجھ کو امید تھی کہ یہ جھوٹ نہیں بولے گا۔ آج کل تو ڈاکٹر بھی اخلاق کی سطح سے گر پڑتے ہیں۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بھی غلط لکھ ڈالتے ہیں' لیکن میں جس وقت کی بات کر رہا ہوں اس وقت ڈاکٹر اور حکیم کسی لالچ میں نہیں آتے تھے اور اپنے آپ کو انسانیت کی اونچی سطح پر رکھتے تھے۔

میں نے اس شخص کو جو لہراسب کا خاص آدمی تھا' یہ تاثر دے کر گھر بھیج دیا کہ میں نے اُس کو ویسے ہی تکلیف دی ہے بلکہ اس طرح اس سے معافی مانگی جیسے میں بالکل چھوٹا سا آدمی تھا اور اس کو بڑا آدمی سمجھتا تھا۔ یہ میں نے اس واسطے کیا تھا کہ یہ شخص اگر قتل کا ملزم ہے بھی تو خوش ہو کر جائے کہ اس پر ذرا سا بھی شک نہیں۔ یہ اب ہندو حکیم پر منحصر تھا کہ صبح وہ کیا بیان دیتا ہے۔

آصف کے بھائی سے میں نے آصف کے دوستوں کی بابت پوچھا تھا۔ اُس نے دو تین نام بتائے تھے۔ میں نے ایک ہیڈ کانسٹیبل کو بلا کر کہا کہ ان دو آدمیوں کو جگا کر تھانے لے آئے۔

دونوں جلدی آ گئے۔ جلدی آنے کی وجہ یہ تھی کہ آصف کی میّت ابھی گھر میں رکھی ہوئی تھی۔ اُس کو صبح دفن کرنا تھا اس واسطے اس کے یار دوست اُس کے گھر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ہیڈ کانسٹیبل ان کو وہاں سے لے آیا۔ پہلے میں نے اس کے ایک دوست کو سامنے بٹھایا اور اُس سے پوچھا کہ اس کے خیال میں قاتل کون ہو سکتا ہے۔

"بہت سوچا ہے" — اُس نے جواب دیا — "ہم دوستوں نے الگ بیٹھ کر بہت مغز مارا ہے، لیکن کچھ سمجھ نہیں آتی"۔

"کیا تم بتا سکتے ہو" — میں نے پوچھا — "کل شام وہ کسی کے ساتھ نکلا تھا یا اکیلا گیا تھا؟ وہ شہر سے اتنی دُور کس واسطے گیا تھا؟"

"یہ بتا سکتا ہوں" — اُس نے جواب دیا — "ہماری بڑی گہری یاری تھی، اور پھر جناب! آصف کی عادت تھی کہ ہر غلط کام کر کے ہمیں بڑے فخر سے اور خوشی سے سنایا کرتا تھا۔ وہ جو تھی شاہدہ!.... چوہدری لہراسب کی دوسری بیوی .... اُس سے وہ کبھی کبھی ملا کرتا تھا۔ شاہدہ کے گھر کا ایک نوکر یہاں آیا تھا۔ اس کو آصف نے کہا تھا کہ شاہدہ کو کہنا آج کی رات اُسی وقت اسی جگہ ملے۔ شام کو جب اندھیرا ہو گیا تو آصف نے مجھ کو بتایا تھا کہ وہ شاہدہ کی ملاقات کے لیے جا رہا ہے۔ وہ شاہدہ کے واسطے ایک ریشمی دوپٹہ تحفے کے طور پر لے جا رہا تھا۔ میرے سامنے وہ اُسی وقت چلا گیا تھا پھر صبح خبر ملی کہ وہ قتل ہو گیا ہے۔ ہم یہی سمجھے کہ اُس کو شاہدہ کے باپ نے یا بھائیوں نے قتل کروایا ہے"۔

اتنی سی بات سُن کر میرے دل میں یہ شک آ گیا کہ آصف شاہدہ کے پیچھے ہی قتل ہُوا ہے اور قاتل شاہدہ کے گھر کا کوئی فرد ہو سکتا ہے۔ جہاں تک میں شاہدہ کے باپ، دو بھائیوں اور شاہدہ کو جانتا تھا میری رائے یہ تھی کہ یہ کھوکھلے اور شوباز لوگ ہیں اور اُن پر امیر بننے کا خبط بھی سوار ہے۔ مجھ کو یہ بھی معلوم تھا کہ اس کے باپ نے رقم لے کر اپنی بیٹی لہراسب کو دی تھی۔ اگر آصف ان کی بیٹی کے ساتھ غلط تعلق نہ جوڑ لیتا یا اس کو پردے میں رکھتا تو اُن کی بیٹی کو لہراسب طلاق نہ دیتا۔ انہوں نے لہراسب کی جائیداد کے جو خواب دیکھتے تھے وہ ٹوٹ پھوٹ گئے اور اُن کی نگاہ میں یہ سب آصف کی وجہ سے ہُوا۔ ان کو پتہ

چل گیا ہو گا کہ آصف اب بھی اُن کی بیٹی کا پیچھا نہیں چھوڑ رہا۔ انہوں نے اپنی بیٹی پر نگرانی رکھی ہو گی۔ گزشتہ رات یہ دونوں موقعہ پر پکڑے گئے ہوں گے۔ اس کا نتیجہ یہی ہونا تھا جو ہُوا۔

مقتول کے اس دوست نے بھی مقتول کے بھائی کی طرح بتایا کہ آصف کس ٹائپ کا آدمی تھا۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ آصف شاہدہ کو تحفے دیتا رہتا تھا اور اس کی یہ آمدنی جوئے سے ہوتی تھی یا قصبے میں ہی وہ زراعت کے ایک چھوٹے سے دفتر میں ملازم تھا جہاں وہ حرام کے کچھ پیسے کما لیتا تھا۔

مقتول کے دوسرے دوست کو بلایا۔ میں نے ان دونوں دوستوں سے خاص طور پر پوچھا تھا کہ لہراسب کی بابت کبھی آصف نے بات کی تھی یا نہیں۔ دونوں نے بتایا کہ شروع شروع میں کوئی بات ہوتی تھی۔ اُس کے بعد یہی ہُوا کہ لہراسب اور آصف کی سلام و دعا بند ہو گئی تھی۔ آصف نے کبھی بھی ایسا خطرہ ظاہر نہیں کیا تھا کہ اُس سے لہراسب انتقام لے گا۔

ان دونوں دوستوں نے میرے پوچھنے پر دو عورتوں کے نام لیے جن کے ساتھ آصف کے درپردہ تعلقات تھے، لیکن انہوں نے بتایا کہ وہ نہایت معمولی سے گھروں کی عورتیں ہیں اور وہ ایسے ہی اخلاق کی ہیں جیسا آصف تھا۔ وہاں کوئی ایسا خطرہ نہیں تھا کہ اُن کے گھروں کے آدمی قتل کی جرأت کریں گے۔

ایک بات ذہن میں رکھ لیں۔ آج کل قتل کی وارداتیں اس طرح ہوتی ہیں جس طرح آدمی مکھی یا مچھر کو مار دیتا ہے۔ اس سے ہماری اُس نسل کے ذہن میں یہ خیال بیٹھ گیا ہے کہ کوئی بھی شخص کسی بھی شخص کو جب چاہے بلکہ لوگوں کے سامنے بھی قتل کر سکتا ہے اور پولیس سے مِل ملا کر قتل ہضم بھی کر سکتا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ بعض مغز پھرے نوجوان شغل کے طور پر

ریوالور یا کلاشنکوف فائر کر کے ایک دو آدمیوں کو ختم کر کے غائب ہو جاتے ہیں۔

ہر روز اخباروں میں آٹھ دس خبریں تو قتل کی ہوتی ہیں۔ بیٹے نے باپ کو قتل کر دیا۔ باپ نے بیٹے کے ساتھ مِل کر بہو کو قتل کر دیا۔ داماد نے اپنی بیوی' ساس اور سُسر کو قتل کر دیا۔ نامعلوم افراد نے گولیاں چلا کر چار آدمیوں کو قتل کر دیا۔ پورا خاندان قتل ہو گیا۔ عورت کو بے آبرو کر کے قتل کر دیا۔ قاتلوں کا کچھ پتہ نہیں نہ پولیس کا کچھ پتہ ہے کہاں ہے۔

بات کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آج کل کے لوگ قتل کو بڑی آسان اور معمولی واردات سمجھتے ہیں اسی واسطے قتل کی خبر پڑھ کر اور سُن کر آج کل کی نسل نہ حیران ہوتی ہے نہ افسوس کرتی ہے۔ ہمارے وقتوں کے جو لوگ زندہ ہیں' ان سے پوچھیں۔ عام طور پر دیہات میں لوگ خاندانی دشمنی کی بنا پر ایک دوسرے کو قتل کرتے تھے اور یقین کریں کہ جس علاقے میں قتل کی واردات ہوتی تھی وہاں سرخ آندھی چلا کرتی تھی۔ شہروں کے لوگ قتل کی خبر سُن کر خوف و ہراس میں مبتلا ہو جاتے تھے۔

پہلے دودھ پیتا بچّہ قتل ہو گیا' اس کا کیس ختم ہونے کے بعد آصف قتل ہو گیا تو شہر کے معزّزین جو صحیح معنوں میں معزّز تھے' وفد بن کر میرے پاس تھانے میں آئے اور کہا کہ جناب' دیہات میں تو لوگ قتل ہوتے ہی رہتے ہیں لیکن اس شہر پر یہ کیا قہر آپڑا ہے کہ چند مہینوں میں دو قتل ہو گئے ہیں۔ جناب شہر کو بدمعاشوں سے پاک کریں۔

اس وفد میں دو ہندو سیٹھ بھی تھے۔ ہندو خون سے بہت ڈرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ہم شہر سے باہر نکلا کرتے ہیں۔ اس طرح تو ہم بھی قتل ہو جائیں گے.... میں نے اُن کو تسلّی دی اور کہا آصف کوئی شریف آدمی نہیں تھا۔ اس

نے اپنے کرتوتوں کی سزا پائی ہے۔ لیکن میں قاتل کو پکڑوں گا اور سزا دلوا کر دم لوں گا۔

ذرا غور فرمائیں کہ تھانیدار ہر کسی کے آگے جوابدہ تھا۔ مقتول کے لواحقین کے آگے' پبلک کے آگے اور اپنے بالائی افسروں کے آگے۔

وہ بھی لاپتہ ہو گئی

اب میں تفتیش کی طرف آتا ہوں۔ آصف کے دوستوں نے بات صاف کر دی کہ آصف شاہدہ کو ملنے گیا تھا۔ ان دونوں دوستوں سے میں نے بہت ساری باتیں معلوم کر لی تھیں' لیکن یہ سب اس کے کیریکٹر کی بابت تھیں۔ قتل کا کوئی سراغ نہیں ملتا تھا سوائے اُس کے کہ وہ شاہدہ کو ملنے جا رہا تھا۔ مجھ کو زیادہ شک تو لہراسب پر تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ لہراسب نے اس کو شہر سے باہر جاتے دیکھا تو اس کے پیچھے اپنے آدمی بھیج کر اُس کو قتل کرا دیا۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ مجھ کو یاد ہے کہ تین بجنے والے تھے۔ سمجھو کہ رات گزر گئی تھی۔ میں نے آصف کے دوستوں کو رخصت کر دیا۔ لہراسب کو تھانے میں ہی رکھنا تھا۔ میں اپنے گھر چلا گیا۔ دماغی اور جسمانی تھکان اتنی زیادہ تھی کہ وردی اُتاری' کپڑے پہن کر بستر پر گرا اور سو گیا۔

صبح تھانے گیا اور سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ہندو حکیم کو بلایا اور لہراسب کے نوکر شرفو کو بھی بلایا۔

ہندو حکیم سے لہراسب کے اس خاص آدمی کی بابت پوچھا کہ وہ اُس کے گھر کس وقت گیا اور کس وقت واپس آیا تھا اور اُس کو کیا بیماری تھی۔ حکیم نے ہر بات ٹھیک بتائی۔ اس بیمار شخص نے جو بیان دیا تھا حکیم نے اس کی تصدیق کر دی اور اس نے یہ بھی کہا کہ یہ شخص پانچ دن اور چارپائی سے اُٹھنے

کے قابل نہیں ہو گا۔ یہ تو میں نے خود بھی دیکھا تھا کہ وہ جب میرے پاس آیا تھا تو اس کو بہت تیز بخار تھا۔

حکیم کو بھیج کر شرفو کو بلایا۔

"تم تو بہت اچھے اور شریف آدمی ہو شرفو!" — میں نے اُس کے ساتھ دوستوں کی طرح بات کی — "پہلے بھی تم نے مجھ سے کوئی بات نہیں چھپائی تھی۔ اب بھی کچھ نہ چھپانا.... یہ بتاؤ کہ پرسوں شام چوہدری لہراسب گھر سے نکلا تھا اور کس وقت واپس آیا تھا؟"

"شام ہوتی ہے تو میرا کام ختم ہو جاتا ہے" — شرفو نے جواب دیا — "چوہدری لہراسب کی حویلی کے پچھواڑے میرا گھر ہے۔ میں اپنے گھر چلا جاتا ہوں۔ چوہدری یا چوہدرانی کا کوئی کام ہوتا ہے تو مجھ کو اوپر سے آواز دیتے ہیں لیکن اُن کو کبھی ایسا کام نہیں پڑا۔ بہت کم ایسا ہُوا ہے کہ انہوں نے مجھ کو بلایا ہو"۔

میں نے بچّے کے قتل کی تفتیش میں اس شخص شرفو کو شامل تفتیش کیا تھا۔ اس کی بابت میری رائے یہ تھی کہ بالکل سیدھا آدمی تھا بلکہ بُدھو سا بھی تھا۔ اس قسم کے نوکروں کو قتل جیسے جرم میں شامل کرنا تو دور کی بات ہے' ان کو معمولی سے راز کی بات بھی نہیں بتائی جاتی۔ پھر بھی میں نے اس سے بہت ساری باتیں پوچھیں لیکن مجھ کو کچھ بھی حاصل نہ ہُوا۔ میں نے اس کو ڈرایا بھی اور اس کے چہرے کو غور سے دیکھتا رہا۔ میں آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ 'اُلّو' ہے اور ایسے الو کو کوئی عقلمند آدمی قتل جیسے جرم میں شامل نہیں کرتا۔

اب ایک تماشہ دیکھیں جس نے مجھ کو چکرا دیا۔ میرے سامنے شرفو بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کے ساتھ میں آخری دو باتیں کر رہا تھا کہ مجھ کو اطلاع ملی کی شاہدہ

کا باپ اور ایک بھائی' ان کے گاؤں کا نمبردار اور دو آدمی آئے ہیں۔ مجھ کو نمبردار کا تو زیادہ خیال نہ تھا' یہ سنا کہ شاہدہ کا باپ اور بھائی آئے ہیں تو مجھ کو سوچ آئی کہ ضرور کوئی بات ہو گی۔ شرفو کو تو اب اُٹھانا ہی تھا۔ اُس کو گھر جانے کی اجازت دے دی اور اُن سب لوگوں کو بلایا۔ میرے پاس شاہدہ کا باپ' بھائی اور نمبردار آئے۔ تینوں کے چہرے لٹکے ہوئے تھے۔ میں نے پوچھا تو شاہدہ کا باپ بولا۔

"جناب!" — اُس نے کہا — "شاہدہ لاپتہ ہے"

"کب سے؟"۔

"اُس رات سے!" — اس نے جواب دیا — "جس رات آصف قتل ہُوا تھا"۔

"دو راتیں اور پورا ایک دن گزر گیا ہے" — میں نے کہا — "اور آپ آج تھانے اطلاع لائے ہیں"۔

اُس نے وہی جواب دیا جو ہر اس لڑکی کا باپ یا بھائی دیا کرتا ہے جو بقائمی ہوش و حواس گھر سے غائب ہو جایا کرتی ہے۔ جواب یہ ہوتا ہے کہ پہلے خود لڑکی کو اِدھر اُدھر ڈھونڈتے ہیں اور دل میں یہ اُمید رکھتے ہیں کہ لڑکی جھک مار کر رات تک واپس آجائے گی۔ لڑکی والے بے چارے اپنی بے عزتی اور بدنامی سے ڈرتے ہیں اور دعائیں کرتے ہیں کہ لڑکی جس طرح درپردہ گئی ہے اسی طرح درپردہ واپس آجائے اور کسی غیر کو پتہ ہی نہ لگے۔ جب دو تین روز گزر جاتے ہیں تو پیروں اور عاملوں کی طرف چل پڑتے ہیں اور وقت ضائع کرتے ہیں۔ آخر مایوس ہو کر تھانے میں آتے ہیں۔ اُس وقت تک لڑکی بہت دُور پہنچ چکی ہوتی ہے اور قتل ہو جائے تو اس کی لاش کا نام و نشان اور ہر سراغ مِٹ چکا ہوتا ہے۔

اس شخص نے تو صرف ایک دن اور دو راتیں ضائع کی تھیں۔ میرے واسطے شاہدہ کی گمشدگی کی اطلاع اس وجہ سے اہم تھی کہ اُسی رات آصف اس کی ملاقات کے واسطے جا رہا تھا اور قتل ہو گیا۔ اس وجہ سے میرے دماغ میں کئی شک آ گئے۔ ایک یہ کہ شاہدہ اور آصف کو ان لوگوں نے اکٹھے دیکھ لیا اور آصف کو قتل کر دیا۔ انہوں نے اپنی لڑکی کو بھی قتل کر دیا ہو گا اور پردہ ڈالنے کے واسطے کہہ دیا کہ وہ لاپتہ ہے۔ دوسرا یہ کہ شاہدہ اچھے چال چلن کی لڑکی نہیں تھی۔ اُس کے تعلقات کسی اور کے ساتھ بھی ہوں گے۔ اس شخص نے آصف کو قتل کر دیا اور شاہدہ کو ساتھ لے گیا اور اُس نے شناخت سے بچنے کے واسطے آصف کو قتل کیا ہو گا۔

مجھ کو زیادہ شک شاہدہ کے باپ اور بھائی پر تھا۔ اگر انہوں نے شاہدہ کو قتل کیا تھا تو اس واسطے نہیں کیا تھا کہ اُن کی لڑکی کے تعلقات ایک آدمی کے ساتھ تھے۔ ان کو غصہ یہ تھا کہ انہوں نے ایک دولت مند داماد یعنی لہراسب کو پھانس لیا تھا۔ اُن کی بیٹی اچھی جگہ لگ گئی تھی اور ان کے اپنے کھانے پینے کا ذریعہ بن گیا تھا مگر لڑکی نے اور ہی گُل کھلا دیے۔ اُس نے حرام بچّہ پیدا کیا۔ یہ معاملہ عدالت میں بھی گیا اور سارے شہر نے سنا اور ان کے اپنے گاؤں میں یہ بات پھیلی، اور پھر شاہدہ کو طلاق جو ملی تھی، بنا بنایا کھیل ختم ہو گیا تھا۔ اب بھی یہ لڑکی عیش موج سے باز نہیں آئی تھی۔

میرے اس سوال کے جواب میں کہ لڑکی کس طرح لاپتہ ہوئی ہے، شاہدہ کے باپ نے بتایا کہ شام کے بعد وہ ایک سہیلی کا نام بتا کر گھر سے نکلی کہ اس کے گھر جا رہی ہے۔ نو بجے کے بعد کا وقت ہو گیا اور وہ نہ آئی۔ مزید وقت گزر گیا تو ہم سب پریشان ہونے لگے۔ شاہدہ کی ماں اُس کی سہیلی کے گھر گئی۔ وہاں

سب سوئے ہوئے تھے۔ شاہدہ کی ماں کو وہاں سے یہ اطلاع ملی کہ شاہدہ اُس گھر میں آئی تھی اور چلی گئی۔ اس کو اُس گھر سے گئے ہوئے ایک گھنٹے سے زیادہ وقت گزر گیا تھا۔ اس سے یہی کہہ سکتے تھے کہ شاہدہ نے اپنے گھر سے نکلنے کا یہ بہانا بنایا کہ وہ سہیلی کے گھر جا رہی ہے اور اپنے آشنا آصف کے پاس جانے کے واسطے سہیلی کے گھر سے نکلی کہ اپنے گھر جا رہی ہے۔

میں نے وہ جائے وقوعہ غور سے دیکھی تھی جہاں آصف کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ یہ ساری واردات گندم کی فصل میں ہوئی تھی۔ میں نے پہلے بتایا ہے کہ بہت ساری فصل ٹوٹی ہوئی تھی جس سے ہم کہہ سکتے تھے کہ یہاں لڑائی ہوئی ہے۔ ٹوٹی ہوئی فصل میں کھُرا ملنا ناممکن تھا۔ مینڈھوں پر لوگوں نے چل پھر کر کھُرے مٹا دیے تھے۔ اُس سے میرا بہت نقصان ہُوا تھا۔ وہاں ایسا کوئی کھُرا یا کوئی اور نشان نہیں تھا جس سے پتہ لگتا کہ یہاں ایک عورت بھی موجود تھی۔

سینڈل اور چوڑیوں کے ٹکڑے

"چوہدری صاحب!" —— میں نے شاہدہ کے باپ کو کہا —— "آپ کی بیٹی بالغ تھی۔ وہ تو ایک بچّے کی ماں بھی بن چکی تھی۔ پھر اُس کا جو چال چلن آپ کے سامنے آیا ہے وہ آپ نے دیکھ لیا ہے۔ وہ اپنی مرضی سے گئی ہے"۔

"یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟" —— شاہدہ کے بڑے بھائی نے کہا —— "آپ کے پاس ایسا کوئی ثبوت تو نہیں کہ وہ اپنی مرضی سے گئی ہے"۔

"میرے پاس یہ ثبوت تو ہے کہ تمہاری بہن بہت بُرے چال چلن والی ہے" —— میں نے کہا —— "جو عورت حرام کا بچّہ پیدا کر سکتی ہے اُس کے واسطے کسی آدمی کے ساتھ چلے جانا کوئی بڑی بات نہیں۔ میں تم کو یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ آصف تمہاری بہن کے پیچھے قتل ہُوا ہے۔ وہ تمہاری بہن کی ملاقات کے

واسطے گیا تھا۔ اس کا تمہارے گاؤں کے قریب جانے کا اور مطلب کیا تھا... کیا تم کہہ سکتے ہو کہ آصف کے ساتھ تمہاری بہن کی ناجائز دوستی نہیں تھی؟"

وہ کچھ نہ بولا۔ شاہدہ کا باپ بھی چُپ کر کے بیٹھا ہُوا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ معلوم نہیں اُس کو غصہ چڑھ گیا تھا یا وہ آنسو روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"کیا تم مجھ کو تھوڑا سا اشارہ دے سکتے ہو کہ تمہاری اس لڑکی کی کسی اور آدمی کے ساتھ دوستی ہے؟"— میں نے پوچھا۔

باپ اور بیٹے نے سر ہلا کر بتایا کہ ان کو پتہ نہیں یا لڑکی کی کسی اور کے ساتھ دوستی نہیں۔

"ذرا سوچ کر بتاؤ"— میں نے پوچھا— "کیا گاؤں میں کوئی ایسا جرأت والا ہے جو تمہاری لڑکی کو اُس وقت اٹھا کر لے گیا ہو جب وہ سہیلی کے گھر سے اپنے گھر کی طرف واپس جا رہی تھی؟.... کیا ان دونوں گھروں کے درمیان فاصلہ زیادہ ہے؟"

"نہیں جی!"— شاہدہ کے باپ نے جواب دیا— "ایک ہی گلی ہے اور چوتھا گھر اُس لڑکی کا ہے"۔

"میں دوسری باتوں کو الگ رکھ دیتا ہوں"— میں نے کہا— "چال چلن کو بھی چھوڑو۔ کیا تمہاری کسی کے ساتھ خاندانی دشمنی ہے؟"

"نہیں جناب!"— باپ نے جواب دیا— "ایسی گہری دشمنی کسی کے بھی ساتھ نہیں!"

میں نے نمبردار کی بابت بتایا ہے کہ وہ پولیس اور تفتیش کے معاملات کو سمجھتے تھے۔ شاہدہ کے گاؤں کا نمبردار میرے سامنے موجود تھا۔ اُس نے مجھ کو آنکھوں سے ایک اشارہ کیا جو میں نے سمجھ لیا۔ میں نے شاہدہ کے باپ اور

بھائی کو کہا کہ وہ ذرا باہر انتظار کریں پھر میں ان کو بلا کر رپورٹ لکھوں گا۔

"ایک بہت ضروری خبر آپ کو دینی تھی حضور!"— نمبردار نے کہا— "لیکن انہوں نے اپنی بات شروع کر دی۔ میں آپ کے ڈر سے بولتا نہیں تھا۔ اب رہا نہیں گیا تو...."

"بات کر یار بات کیا ہے!"— میں نے جھنجلا کر کہا۔

وہ بات کرنے کی بجائے باہر چلا گیا۔ واپس آیا تو اس کے ساتھ دو آدمی تھے۔ نمبردار نے ان میں سے ایک آدمی کے ہاتھ میں سے کپڑے میں لپٹا ہُوا کچھ لے کر کپڑا کھولا۔ اس میں سے سینڈل کا ایک پاؤں نکالا۔ یہ کوئی عام سا زنانہ سینڈل نہیں تھا۔ یہ سانپ کی کھال کا بنا ہُوا تھا۔ معلوم نہیں یہ اصلی سانپ کی کھال ہوتی تھی یا عام چمڑے کو سانپ کی کھال کا رنگ دیا جاتا تھا۔ اس کو سنیک لیدر کہتے تھے۔ اس زمانے میں اس کے مردانہ شوز بھی بنتے تھے پھر اس کے زنانہ سینڈل بھی بازار میں آ گئے لیکن یہ اتنے زیادہ قیمتی تھے کہ امیروں کے بیٹے اور بیٹیاں ہی خرید سکتے تھے۔

نمبردار نے مجھ کو بتایا کہ یہ دو آدمی کھیتوں سے گزر رہے تھے۔ ایک کھیت میں مینڈھ سے ذرا اندر سینڈل کا یہ پاؤں پڑا ہُوا تھا۔ ان دونوں آدمیوں کو معلوم تھا کہ یہاں سے دو کھیت آگے ایک آدمی قتل ہُوا تھا۔ اُن کو خیال آیا کہ اس سینڈل کا قتل کے ساتھ تعلق ہو سکتا ہے۔ اگر سینڈل پھٹا ہُوا اور پرانا ہوتا تو سمجھتے کہ بیکار ہونے کے باعث پھینکا ہُوا ہے لیکن یہ نیا تھا اس واسطے انہوں نے اٹھا لیا اور اس گاؤں کے نمبردار کے پاس چلے گئے۔ یہ دونوں ساتھ والے گاؤں کے رہنے والے تھے۔

میں نے پہلے بتایا ہے کہ آج کل راستے میں کوئی زخمی پڑا ہُوا ہو تو کوئی اُس کو اٹھاتا نہیں کہ پولیس دھر لے گی اور نذرانہ لے کر چھوڑے گی۔ ہمارے

وقتوں میں لوگ پولیس کی مدد کیا کرتے تھے اور پولیس لوگوں کی مدد کرتی تھی۔ پبلک اور پولیس کو ایک دوسرے پر اعتبار تھا۔ ان دونوں دیہاتی جوانوں نے اس سینڈل کو تھانے تک پہنچانا اپنا فرض سمجھا۔ بعد میں معلوم ہُوا تھا کہ ان دونوں میں سے ایک کا بڑا بھائی ہیڈ کانسٹیبل تھا جو چھُٹی آتا تھا تو تفتیش اور سراغرسانی کی باتیں سنایا کرتا تھا۔

سینڈل کا یہ پاؤں دیکھ کر میرا دھیان شاہدہ کی طرف گیا۔ میں نے نمبردار سے پوچھا کہ اس نے یہ سینڈل شاہدہ کے باپ کو دکھایا تھا؟

"یہ سینڈل آج صبح میرے پاس آیا ہے"— نمبردار نے جواب دیا— "گزشتہ رات چوہدری (شاہدہ کا باپ) میرے گھر آیا تھا۔ اُس نے مجھ کو بتایا کہ شاہدہ لاپتہ ہے۔ کیا کرنا چاہیے۔ میں نے اس کو مشورہ دیا کہ تھانے میں فوراً رپورٹ ہونی چاہیے۔ یہ کہتا تھا کہ یہ بہت بے عزتی والی بات ہے۔ میں نے اُس کو سمجھالیا اور یہ مان گیا۔ صبح سویرے یہ سینڈل آگیا۔ میں چوہدری کے گھر گیا اور اُس کو سینڈل دکھا کر کہا یہ شاہدہ کا ہی نہ ہو۔ چوہدری سینڈل اندر لے گیا اور باہر آکر کہنے لگا کہ یہ شاہدہ کا نہیں۔ شاہدہ کی ماں نے بھی یہی کہا تھا"۔

میں نے جائے وقوعہ پر جانا ضروری سمجھا۔ یہ سینڈل اچھا سراغ تھا۔ شاہدہ کے باپ اور بھائی کو بلا کر اپنے ایک اے ایس آئی کو بلایا اور اُس کو کہا کہ اُن کی بیٹی کی گمشدگی کی رپورٹ لکھ لے۔ میں نمبردار اور دونوں آدمیوں کو ساتھ لے کر روانہ ہو گیا۔ میرے کہنے پر وہ مجھ کو اس جگہ لے گئے جہاں سینڈل پڑا ملا تھا۔

اس کھیت میں بھی گندم کی فصل تھی۔ خوشے آ گئے تھے۔ فصل اونچی تھی۔ مینڈھ کے قریب سے اندر تک فصل ٹوٹی ہوئی تھی۔ کچھ پودے ابھی کھڑے تھے باقی سب ٹوٹے ہوئے تھے۔ ان دونوں آدمیوں نے بتایا کہ سینڈل

کہاں پڑا تھا۔ ان کو تو صرف سینڈل نظر آیا تھا۔ میں پولیس کی سراغرساں نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

میں نے وہ ساری جگہ دیکھی جہاں فصل ٹوٹی ہوئی تھی۔ میں نے گرے ہوئے پودے ہٹا کر بھی دیکھا اور میں جو چیز ڈھونڈ رہا تھا وہ مجھ کو مل گئی۔ سینڈل نے یہ گواہی دی تھی کہ یہاں ایک عورت کو لایا گیا تھا۔ ٹوٹی ہوئی فصل گواہی دے رہی تھی کہ یہاں عورت کے ساتھ دھینگا مشتی ہوئی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ عورت کو زبردستی لے جایا جا رہا تھا اور یہاں آکر عورت نے آگے جانے سے انکار کر دیا اور اس کو گھسیٹا گیا اور اُس کو دھکے مارے گئے۔ وہ فصل میں بیٹھ گئی ہو گی۔ ساتھ لے جانے والوں نے اس کو کندھوں پر اٹھا لیا ہو گا۔ اس دھینگا مشتی میں ایک سینڈل یہیں رہ گیا۔

جہاں عورت کے ساتھ اس طرح کی زیادتی اور زبردستی ہوتی ہے وہاں لازمی طور پر عورت کی چوڑیاں ٹوٹتی ہیں۔ میں چوڑیوں کے ٹکڑے ڈھونڈ رہا تھا۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ اس عورت کے بازوؤں میں چوڑیاں ہوں۔ سونے کے باریک کڑے ہو سکتے تھے۔ یہ بھی ضروری نہیں تھا۔ بازو خالی بھی ہو سکتے تھے۔ سینڈل سے پتہ لگتا تھا کہ عورت امیر گھر کی ہے۔

مجھ کو چوڑیوں کے ٹکڑے مل گئے۔ یہ میرے اندازے کے عین مطابق تین چوڑیوں کے ٹکڑے تھے۔ یہ کانچ کی چوڑیاں تھیں۔

میں اُس جگہ کی طرف چل پڑا جہاں آصف کی لاش پائی گئی تھی۔ کھُرا تو مل نہیں سکتا تھا۔ میں نے اپنی عقل استعمال کی۔ میں مینڈھ کے دونوں طرف فصل دیکھتا جا رہا تھا۔ مینڈھ چوڑی تو نہیں تھی۔ دو آدمی اکٹھے اس پر نہیں چل سکتے تھے۔ مجھ کو کئی جگہوں پر مینڈھ کے ساتھ کہیں دائیں کہیں بائیں ٹوٹی ہوئی یعنی روندی ہوئی فصل دکھائی دی۔

میں یہ دیکھتا ہوا جائے وقوع پر پہنچا۔ میرا قیاس یہی کہتا تھا کہ یہ شاہدہ تھی یا کوئی اور تھی' یہ آصف کے ساتھ تھی اور اُسی کے پیچھے آصف مارا گیا اور قاتل اس عورت کو لے گئے۔ اب سوال یہ تھا کہ یہ عورت کون تھی؟ کیا یہ شاہدہ تھی؟ اگر شاہدہ ہی تھی تو اُس کو کون لے گیا؟

حق مہر وصول کرلیا

میں نے مزید وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ گاؤں بالکل قریب تھا۔ میں نے ان دو آدمیوں کے نام اور گاؤں لکھ کر اُن کو چھٹی دے دی اور کہا کہ وہ گاؤں میں حاضر رہیں۔ جب ضرورت پڑی اُن کو بلا لیں گے۔ میں گاؤں میں جا کر نمبردار کی بیٹھک میں بیٹھ گیا اور شاہدہ کی ماں کو بلایا۔ وہ روتی ہوئی آئی۔ میں نے سینڈل کا برآمد شدہ پاؤں اس کے آگے رکھ کر پوچھا کہ یہ شاہدہ کا ہے؟

اُس نے زبان سے نہیں سر ہلا کر بتایا کہ یہ سینڈل شاہدہ کا نہیں۔

چوڑیوں کے ٹکڑے دکھائے تو یہ بھی اس نے شناخت نہ کئے۔

"تمہارا کیا خیال ہے" — میں نے پوچھا — "شاہدہ کس کے ساتھ گئی ہو گی؟ .... بیٹیاں اپنی ماؤں کو دل کی بات بتا دیا کرتی ہیں"۔

"مجھ کو کچھ سمجھ نہیں آتی" — اُس نے کہا — "میں صرف یہ بتا سکتی ہوں کہ آصف نے اس کا پیچھا ابھی نہیں چھوڑا تھا"۔

"میرا خیال ہے تمہاری بیٹی نے بھی آصف کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا" — میں نے کہا۔

"یہ ٹھیک ہے" — اس نے کہا — "لیکن آصف تو قتل ہو گیا ہے"۔

"کیا گاؤں میں کوئی ایسا شخص ہے جو شاہدہ سے شادی کرنا چاہتا ہو؟" — میں نے پوچھا — "اور تم لوگوں نے اس کو جواب دے دیا ہو؟"

"اس کے ساتھ کون شادی کرے گا؟" — ماں نے جواب دیا — "ساری دنیا کو معلوم ہے کہ اُس کو خاوند کی بجائے کسی اور کا بچّہ پیدا کرنے کی وجہ سے طلاق ملی ہے۔ اب تو ہمارا کوئی نوکر اور کوئی مزارعہ بھی اس کو قبول نہ کرے"۔

"تم کہتی ہو کہ آصف تمہاری بیٹی کا پیچھا نہیں چھوڑتا تھا" — میں نے کہا — "اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں' تمہارے خاوند اور تمہارے بیٹے کو بھی معلوم تھا کہ شاہدہ اور آصف ملتے ملاتے رہتے تھے"۔

"ہاں جی!" — اُس نے جواب دیا۔

"پھر تمہارے خاوند اور بیٹے نے ان کو ملنے سے روکا کیوں نہیں؟"

"میں نے بیٹی کو کئی بار کہا تھا کہ تم پہلے ہی بہت بدنام ہو گئی ہو' اب باز آجاؤ" — شاہدہ کی ماں نے کہا — "شاہدہ کہتی تھی کہ اب اُس کا آصف کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رہا"۔

میں اس سے اس شک پر تفتیش کر رہا تھا کہ آصف کو شاہدہ کے باپ اور بھائی نے خود مارا ہے اور شاہدہ کو بھی۔ شاہدہ کی ماں عقل سے عاری معلوم ہوتی تھی۔ اُس کے بعض جواب میری سمجھ میں ہی نہیں آتے تھے۔ مجھ کو شک ہوتا تھا کہ یہ عورت بہت چالاک ہے اور بھولی بنی ہوئی ہے یا ہے ہی بھولی اور بدّھو۔

"تمہارے خاوند اور تمہارے بیٹے میں غیرت ہے ہی نہیں" — میں نے اُس کو بھڑکانے کے واسطے کہا — "اگر ان میں غیر ہوتی تو اپنی بیٹی کی ٹانگیں توڑ دیتے اور آصف کو قتل کر دیتے۔ تم لوگ نام کے ہی چوہدری ہو"۔

"نہیں جی!" — اس نے کہا — "باپ نے ایک بار شاہدہ کی پٹائی کر دی تھی"۔

"اُس کو پتہ لگ گیا ہو گا کہ شاہدہ کسی جگہ آصف کو ملی ہے"— میں نے کہا۔

"مجھ کو وہ اتنی باتیں نہیں بتاتے"— اس نے جواب دیا— "میں وہی کہا کرتی ہوں جو وہ کہا کرتے ہیں"۔

اس عورت کی بعض باتوں پر مجھ کو ہنسی آجاتی اور بعض باتوں پر غصہ آجاتا تھا۔ اس کی تفتیش بہت دلچسپ تھی لیکن میں پوری اس واسطے سنا نہیں سکتا کہ بہت لمبی ہے۔ میں اصل ملزم کو آپ کے سامنے جلدی کھڑا کرنے کی فکر میں ہوں۔ اس عورت کی بابت صرف یہ جان لینا ضروری ہے کہ اس کے اُلٹے سیدھے، بلکہ کیا سیدھے اور کیا اُلٹے جوابوں نے مجھ کو اپنے خاوند یعنی شاہدہ کے باپ کے خلاف پکّے شک میں ڈال دیا کہ شاہدہ کو ان لوگوں نے خود غائب کیا ہے۔ اب یہ معلوم کرنا تھا کہ اس کو صرف غائب کیا ہے یا قتل کر دیا ہے۔ یہ شک تو خود ہی پکّا ہونا تھا کہ آصف کو انہوں نے ہی قتل کیا ہے۔

شاہدہ کے باپ کی بابت پہلے بتا چکا ہوں کہ اونچی ذات اور اونچی حیثیت کا آدمی تھا لیکن لالچی اور شوباز۔ اس نے اپنی اولاد میں بھی یہی وصف پیدا کیا ہُوا تھا۔ بچّے کے قتل کا لہراسب نے اقبالی بیان دیا تھا تو اس میں اس نے شاہدہ کے باپ اور ماں کی مکمل تصویر پیش کی تھی۔ میں نے آپ کو یہ بیان مکمل نہیں سنایا تھا۔ لہراسب نے کہا تھا کہ اس نے شاہدہ کو اس کے باپ سے خریدا تھا اور شاہدہ کی ماں تو بڑی بے تکلّفی سے پیسے مانگ کر وصول کیا کرتی تھی۔ لہراسب نے ان کو اوچھے لوگ کہا تھا۔

اب میں ان لالچی اور اوچھے خاندان کے گاؤں میں بیٹھا ہُوا تھا۔ شاہدہ کی ماں نے میرا بہت سارا مغز چاٹ لیا تھا۔ میں نے اس کو باہر بٹھا دیا۔ میرے ساتھ ایک ہیڈ کانسٹیبل اور دو کانسٹیبل تھے۔ میں نے ان کو کہا کہ اس عورت کو

گھر نہ جانے دیں اور یہ کسی کے ساتھ بات نہ کرے۔

مجھ کو نمبردار نے بتایا کہ شاہدہ کا باپ اور بھائی تھانے سے آگئے ہیں۔ میں نے کہا کہ دونوں کو اُدھر ہی روک لو اور تم میرے پاس آجاؤ۔

"مجھ کو شاہدہ اور اس کے باپ وغیرہ کی بابت بتاؤ"— نمبردار جب باہر سے واپس آیا تو میں نے اس کو کہا— "اگر تمہیں معلوم ہے تو بتاؤ کہ شاہدہ کی دوستی کسی اور کے ساتھ ہو گی، وہ کون ہے؟"

"گھٹیا لوگ ہیں"— نمبردار نے جواب دیا— "ایسی حرکتیں وہ لوگ کرتے ہیں جن کی کوئی ذات نہیں ہوتی اور ان کو کہیں سے خواہ مخواہ دولت مل جاتی ہے۔ شاہدہ کے باپ کی ذات آپ کو معلوم ہے۔ سب سے اونچی ذات ہے۔ زمین بھی بہت ہے اور اللہ کا دیا اتنا ہے کہ کوئی کمی نہیں لیکن من بھوکا رہتا ہے۔ شوبازی اتنی کہ جیسے اس علاقے کے یہ بادشاہ ہوں۔ عزت اور غیرت کا یہ حال کہ بیٹی خوبصورت نکلی تو اسی کے نام پر کھانا پینا شروع کر دیا۔ وہ اس طرح کہ لڑکی کے رشتے آئے تو ہر لڑکے والوں سے کھاتے پیتے رہے۔ پھر ایک کے ساتھ منگنی کر دی۔ ان سے انگوٹھی اور کپڑے لے کر ایک سال ان سے خاطر تواضع کراتے رہے پھر منگنی توڑ کر ایک اور لڑکے کے ساتھ منگنی کر دی۔۔

"اس گھر کو کھاتے کھاتے چھ سات مہینے گزار دیے اور لڑکی چوہدری لہراسب کو دے دی۔ شہرت یہی ہے کہ چوہدری لہراسب سے اس شخص نے نقد رقم لی تھی۔ لڑکی وہاں سے جو اُڑا کر لاتی رہی وہ بھی بہت مشہور ہے۔ لڑکی نے جو بچّہ پیدا کیا اس کی اصلیّت آپ کو معلوم ہے۔ لڑکی طلاق لے کر اور اپنے منہ پر بدکاری کی کالک مل کر گھر آگئی تو ان لوگوں کو ذرا بھی شرم نہیں آئی بلکہ بڑے رعب سے شاہدہ کا باپ کہتا رہا کہ ہم حق مہر وصول کریں گے۔ آخر اس

شخص نے آدھا حق مہر وصول کر لیا۔

"دیکھ چوہدری!" — میں نے نمبردار سے کہا — "تمہاری رائے اس معاملے میں کیا ہے کہ شاہدہ کے باپ یا بھائی کو پتہ لگ گیا تھا کہ شاہدہ آصف کو ملتی ہے۔ اس واسطے انہوں نے دونوں کو قتل کر دیا اور شاہدہ کی لاش غائب کر دی"۔

"حضور والا!" — نمبردار نے کہا — "میں بغیر ثبوت اور شہادت کے کس طرح کہہ سکتا ہوں کہ آصف اور شاہدہ کو انہوں نے قتل کیا ہے ، یہ کہہ سکتا ہوں کہ شاہدہ کو انہوں نے قتل نہیں کیا۔ غائب کر دیا [illegible] اس بیٹی کی وجہ سے تو چوہدری کی شان بنی ہوئی تھی۔ اس کو باپ نے گھر تھوڑا ہی بٹھانا تھا۔ کسی مالدار رنڈوے سے نقد رقم وصول کر کے اس کے ساتھ بیاہ دینا ہے پھر یہ لڑکی کا کام ہے کہ اس مالدار خاوند کا مال کس طرح اپنے گھر پہنچاتی ہے .... جنابِ عالی! یہ لوگ اتنے غیرت مند نہیں کہ لڑکی کو کسی غیر آدمی کے ساتھ دیکھ کر اس کو قتل کر دیں گے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کسی کو پیسے دے کر آصف کو قتل کرا دیا ہو۔ آصف سے ان کو کیا وصول ہونا تھا"۔

میرے دماغ میں یہ بات آ گئی۔ وہ جو سینڈل اور چوڑیوں کے ٹکڑے ملے تھے، ان کو شاہدہ کی ماں اور باپ نے شناخت نہیں کیا تھا۔ کہتے تھے کہ یہ شاہدہ کا سینڈل نہیں۔ مجھ کو خیال یہ آیا کہ شاہدہ گھر سے یہ بتا کر نکلی تھی کہ وہ فلاں سہیلی کے گھر جا رہی ہے۔ اس کی ماں نے بیان دیا تھا کہ شاہدہ سہیلی کے گھر گئی تھی مگر گھر واپس نہیں آئی۔

میں نے نمبردار کو یہ ڈیوٹی دی کہ وہ شاہدہ کی ماں سے جو باہر موجود تھی، اس سہیلی کا نام پوچھے اور اس کو اپنے ساتھ لے آئے۔

وہ رومان پسند لڑکی تھی

اس لڑکی کو میرے پاس آتے زیادہ دیر نہیں لگی۔ اس کا گھر قریب ہی تھا۔ اس کو تسلّی دلاسہ دیا کہ گھبرائے اور ڈرے نہیں۔ میرے سوالوں کے جواب دیتے ہوئے اس نے بتایا کہ شاہدہ اس کی ہمراز سہیلی تھی اور گمشدگی کی رات اس کے گھر آئی تھی۔

میں نے سینڈل کا پاؤں اور چوڑیوں کے ٹکڑے اس کو دکھا کر پوچھا کہ یہ چیزیں شاہدہ کی تو نہیں؟

"اُس نے یہی سینڈل پہنا ہُوا تھا" — اس لڑکی نے بتایا — "اور اس کی چوڑیاں اسی قسم اور اسی رنگ کی تھیں"۔

"کیا شاہدہ نے تمہیں بتایا تھا کہ آصف آ رہا ہے؟" — میں نے پوچھا۔

"ہاں جی!" — اس نے جواب دیا — "آصف کے ساتھ تو اس کا بڑا پکّا تعلق بن گیا تھا"۔

"شاہدہ نے تمہیں یہ بھی بتایا ہو گا" — میں نے کہا — "کہ اس کا باپ اس کو کہتا رہتا ہے کہ آصف کے ساتھ تعلق نہ رکھے"۔

"نہیں جی!" — لڑکی نے کہا — "اس نے ایسی بات کبھی نہیں کی"۔

"میں تمہاری سہیلی کو زندہ برآمد کرنا چاہتا ہوں" — میں نے کہا — "تم بھی یہی چاہتی ہو گی"۔

"ہاں جی!" — اُس نے کہا — "شاہدہ تو میری بہت ہی پیاری سہیلی ہے۔ آپ اس کی تلاش کریں"۔

"تو مجھ کو اس کی ہر بات سچّی سچّی بتاتی چلو" — میں نے کہا — "اس کی کسی اور آدمی کے ساتھ بھی دوستی ہے؟"

"اس کا اس نے کبھی ذکر نہیں کیا" — اس نے جواب دیا — "میرا خیال ہے کسی اور کے ساتھ اس کی دوستی نہیں تھی"۔

اس لڑکی کے ساتھ میں نے کچھ وقت صرف کر کے شاہدہ کی بابت کچھ اور باتیں معلوم کیں۔ اس سے سب سے زیادہ ضروری بات تو یہ معلوم ہوئی کہ یہ سینڈل اور یہ چوڑیاں شاہدہ کی تھیں۔

لڑکی کو میں نے نمبردار کے ساتھ اس کے گھر بھیج دیا اور شاہدہ کے باپ کو بلایا۔ سینڈل اور چوڑیوں کے ٹکڑے میرے سامنے پڑے تھے۔

"کیا سینڈل کا یہ پاؤں تم نے پہلے دیکھا ہے؟" — میں نے پوچھا۔

"نمبردار نے دکھایا تھا" — اس نے جواب دیا — "یہ میری بیٹی کا نہیں"۔

اتنے میں نمبردار اندر آیا اور اس نے شاہدہ کے باپ کے پیچھے کھڑے ہو کر ہلکا سا اشارہ کیا۔ میں نے شاہدہ کے باپ کو کہا کہ وہ باہر بیٹھے۔ اس کے جانے کے بعد نمبردار نے بتایا کہ وہ دو اور لڑکیوں کو ساتھ لایا ہے۔ ان کے ساتھ شاہدہ کا دوستانہ تھا۔ میں نے دونوں کو بلا لیا۔ پہلے تو ان کو سینڈل اور چوڑیوں کے ٹکڑے دکھائے۔ سینڈل کا پاؤں تو دونوں نے فوراً پہچان لیا۔ چوڑیوں کے ٹکڑوں کو دونوں نے غور سے دیکھا۔ آخر فیصلے کے لہجے میں کہا کہ یہ چوڑیاں اسی کی ہیں۔

"سارے گاؤں میں ایسا سینڈل کسی اور گھر میں نہیں ہو گا" — ایک لڑکی نے بتایا۔

ان لڑکیوں سے راز کی کوئی اور بات معلوم نہ ہوئی۔ انہوں نے شاہدہ کی عادتیں بتائیں۔ ایک بھی عادت قابلِ تعریف نہیں تھی۔ وہ رومان پسند لڑکی تھی۔ ایک لڑکی نے بتایا کہ شاہدہ اس سے دو یا تین بار کہہ چکی ہے کہ اب ہو

سکتا ہے میرا باپ مجھ کو کسی بڑی عمر کے آدمی کے ساتھ بیاہ دے لیکن میں اپنی پسند کے کسی آدمی کے ساتھ گھر سے بھاگ جاؤں گی۔

شاہدہ کا کیریکٹر ٹھیک تھا یا خراب تھا' میرا فرض تھا اس کو تلاش کرنا۔ لہراسب سے میرا شک ہٹ گیا تھا۔ یہ اس گاؤں کا یا شاہدہ کے اپنے گھر ہی کا معاملہ معلوم ہوتا تھا۔ مجھ کو پکّی شہادت مل گئی تھی کہ یہ سینڈل اور چوڑیوں کے ٹکڑے شاہدہ کے تھے لیکن شاہدہ کا باپ کہہ رہا تھا نہیں۔ شاہدہ کی ماں نے بھی کہا تھا کہ یہ سینڈل شاہدہ کا نہیں۔ چھوٹی چھوٹی کچھ اور باتیں بھی معلوم ہوئی تھیں جو میرے شک کو پکّا کرتی تھیں۔

میں نے ہیڈ کانسٹیبل کو کہا کہ شاہدہ کے باپ' بھائی اور ماں کو تھانے لے چلو۔ ہیڈ کانسٹیبل ان کو تھانے لے جانے لگا تو شاہدہ کا باپ میرے پاس دوڑا آیا اور شور شرابہ کرنے لگا۔ میں نے اس کو کہا کہ وہ لکھ دے کہ اس کی لڑکی لاپتہ نہیں ہوئی اور اس کی کوئی رپورٹ نہیں .... وہ منت سماجت پر آ گیا۔ میں نے تھانیداری رعب جھاڑا اور ان سب کو تھانے لے گیا۔

شام ہو چکی تھی۔ میں اس ارادے سے گھر کو جانے لگا کہ رات گیارہ بارہ بجے تھانے میں آؤں گا اور ان لوگوں کو تفتیش کی چکّی میں پیسوں گا۔ مجھ کو خیال تھا کہ اتنی دیر انتظار کرتے کرتے ان لوگوں کے دماغ درست ہو چکے ہوں گے لیکن اے ایس آئی نے مجھ کو روک لیا۔ اس کا مسئلہ یہ تھا کہ شہر کے قریب ایک گاؤں کے ایک گھر میں چوری ہو گئی۔ تمام زیور نکل گیا تھا۔

چوری کی یہ واردات سات آٹھ روز پہلے ہوئی تھی اور اس کی تفتیش یہ اے ایس آئی کر رہا تھا۔ ایک مخبر کے ذریعے چوری کا سراغ مل گیا۔ ملزم پیشہ ور چور نہیں تھا لیکن آوارہ نوجوان تھا اور جوئے بازی کا عادی ہو گیا تھا۔ اُس نے اپنے ایک قریبی رشتہ دار کے گھر چوری کی اور پکڑا گیا۔ وہ اقبال جرم نہیں

کر رہا تھا۔ اے ایس آئی نے دوسرا طریقہ اختیار کیا جو ملزم برداشت نہ کر سکا اور اس نے اقبالِ جرم کر کے مال کی نشاندہی کر دی۔

میں نے پہلے ایک عامل کا ذکر کیا ہے جس کا نام نورانی شاہ تھا۔ اے ایس آئی نے مجھ کو ایک اور عامل کا نام بتایا۔ نام مردان قلندر تھا۔ اس کا گھر چھوٹے سے ایک گاؤں میں تھا۔ یہ گاؤں شاہدہ کے گاؤں اور واردات والے گاؤں کے درمیان تھا۔ چوری کے ملزم نے اقبالی بیان میں بتایا کہ اس نے چوری کا مال مردان قلندر کے گھر رکھا ہے۔ اس میں مردان قلندر کا بھی حصہ تھا۔

مردان قلندر ویسا ہی عامل تھا جیسے دیہات اور شہروں میں ہوتے ہیں یا جیسا نورانی شاہ تھا۔ بالکل فراڈ لیکن لوگوں کا عقیدہ تھا کہ اس کے ہاتھ میں کوئی طاقت ہے۔ اے ایس آئی نے معلوم کر لیا تھا کہ مردان قلندر گھر میں اکیلا رہتا تھا۔ اُس نے لوگوں کو اتنا لوٹا تھا کہ اس کا مکان پکّا تھا یعنی اینٹوں کا تھا اور اوپر بھی اس نے دو کمرے بنوائے ہوئے تھے۔

اُس کا گھر بدمعاشوں کا اڈّہ تھا۔ وہاں جُوا بھی چلتا تھا اور شراب بھی۔ یہی بدمعاش اس کی کرامات کا پروپیگنڈہ کرتے رہتے تھے۔ شام کے بعد کوئی سائل اس کے گھر میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ لوگوں میں مشہور تھا کہ رات کو مردان قلندر کے پاس جنّات آتے ہیں۔

مردان قلندر نہ اُس زمانے میں کوئی عجیب چیز تھا نہ ایسے قلندر اور عامل آج کوئی عجیب چیز ہیں۔ اُس زمانے میں بھی یہ عامل لوگوں کی سادگی اور مجبوری سے فائدہ اٹھاتے تھے اور آج بھی اٹھا رہے ہیں۔

اے ایس آئی نے مجھ کو بتایا کہ وہ آج رات مردان قلندر کے گھر چھاپہ مارنا چاہتا ہے۔ ملزم نے رہنمائی کے واسطے ساتھ جانا تھا۔ اے ایس آئی نے مجھ کو بتایا کہ چھاپہ مارنا اس واسطے بھی ضروری ہے کہ اس عامل کے گھر میں

بدمعاشیاں ہوتی رہتی ہیں۔ میں نے اس کو چھاپہ مارنے کی اجازت دے دی اور اس کو کہا کہ وہ جتنی نفری ساتھ لے جانا چاہتا ہے لے جائے اور ضابطے کی کارروائی پوری کرے۔ ایک لازمی کارروائی یہ تھی کہ دو گواہ ساتھ لے جانے تھے جنہوں نے مال کی برآمدگی کی گواہی دینی تھی اور کاغذات پر دستخط کرنے تھے۔ اے ایس آئی نے گواہوں کا انتظام کیا ہُوا تھا۔ میں نے اس کو کہا کہ چھاپہ نو بجے کے لگ بھگ مارے۔

میں اپنے گھر چلا گیا۔ رات گیارہ بجے واپس تھانے آنا تھا۔

لڑکی مردان قلندر کی قید میں

رات کے دس بج چکے تھے۔ میں گہرا سویا ہُوا تھا۔ بیوی نے مجھ کو جگا کر بتایا کہ کانسٹیبل آیا ہے۔ میں باہر گیا تو کانسٹیبل نے ایسی خبر سنائی کہ مجھ کو شک ہُوا کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ یہ کانسٹیبل چھاپہ پارٹی کے ساتھ گیا تھا اور اس گاؤں سے مردان قلندر کی گھوڑی پر آیا تھا۔

”فوراً میری ساتھ چلیں“ ـــ کانسٹیبل نے کہا ـــ ”وہ لڑکی جو لاپتہ ہے، مردان قلندر کے گھر سے برآمد ہوئی ہے“۔

میں نے فوراً وردی پہنی۔ اردلی نے گھوڑی تیار کر دی تھی۔ تھانے جا کر ریوالور لیا اور مردان قلندر کے گاؤں کو روانہ ہو گیا۔ یہ گاؤں کوئی ڈیڑھ میل دور تھا۔ وہاں پہنچے اور مردان قلندر کے گھر میں داخل ہوئے۔ میں نے شناخت کے واسطے شاہدہ کے باپ کو بھی ساتھ لے لیا تھا۔

”مبارک ہو جی!“ ـــ اے ایس آئی نے میرا استقبال کرتے ہوئے کہا ـــ ”میرے مال کے ساتھ آپ کا مال بھی برآمد ہو گیا ہے۔ شاہدہ زندہ مل گئی ہے“۔

مردان شاہ ایک طرف دیوار کے ساتھ تین آدمیوں کے ساتھ اکڑوں بیٹھا ہوا تھا۔ ملزموں کو اسی طرح بٹھایا جاتا ہے۔ مردان قلندر نے زیورات برآمد کرا دیے تھے۔ اے ایس آئی مجھ کو اوپر لے گیا۔ شاہدہ کا باپ ساتھ تھا۔

اوپر کے ایک کمرے میں شاہدہ بیٹھی ہوئی تھی اور ایک دیوار کے ساتھ دو آدمی اکڑوں بیٹھے ہوئے تھے اور دو کانسٹیبل پاس کھڑے تھے۔ میں نے شاہدہ کے باپ سے پوچھا کہ یہ ہے تمہاری بیٹی؟ اُس نے زبان سے کچھ نہ کہا۔ سر ہلا کر بتایا کہ یہ اس کی بیٹی ہے۔

اس باپ کے جذبات کا شاید آپ اندازہ کر سکتے ہوں گے جس کی تین دنوں سے لاپتہ بیٹی دو آدمیوں کے ساتھ کسی اور جگہ پائی گئی ہو۔ وہ دونوں آدمی شاہدہ کے گاؤں کے تھے۔ شاہدہ کے باپ کا یہ حال تھا جیسے وہ کھڑے کھڑے مر گیا ہو۔ اس کی آنکھیں ٹھہر گئی تھیں۔ اس کی شوبازی ختم ہو گئی تھی۔

کون کیا سوچ رہا تھا اور کون کس حال میں تھا' یہ لمبی باتیں ہیں۔ میں پڑھنے والوں کی دلچسپی کی بات سناؤں گا۔ چوری کے ملزم کی نشاندہی پر مردان قلندر پہلی بار پولیس کے شکنجے میں آیا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اُس پر کوئی ہاتھ ڈال ہی نہیں سکتا۔ اے ایس آئی نے مجھ کو بتایا کہ مردان قلندر نے پولیس کو اپنے گھر میں دیکھ کر مستانے سے انداز میں نعرے لگانے شروع کر دیے پھر اے ایس آئی کو کہا کہ اس وقت واپس چلے جاؤ' میرے مؤکل (جنّات) آئے ہوئے ہیں۔ اُن کو غصہ آ گیا تو تمہیں بہت نقصان پہنچائیں گے۔

اے ایس آئی نے اس کے منہ پر بڑی زور سے تھپّڑ مارا۔ وہ شراب کے نشے میں تھا۔ ایک تھپّڑ سے ہی ڈول گیا اور گرتے گرتے بچا۔ ساتھ ایک ہیڈ کانسٹیبل تھا جو ملزموں سے ایذاء رسانی کے ذریعے اقبالی بیان لینے میں مہارت رکھتا تھا۔ اس نے مردان شاہ کے مؤکلوں کو دو تین گالیاں دے کر اس کے سر

کے بال جو اس کے کندھوں تک لمبے تھے' پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا اور اس کو گھما کر چھوڑا تو مردان شاہ دیوار کے ساتھ ٹکرایا اور گر پڑا۔

"چوری کا مال نکال دے"— ہیڈ کانسٹیبل نے اُس کی گردن پر پاؤں رکھ کر دبایا اور کہا— "ایک منٹ سے زیادہ دیر نہ لگے"۔

یہ اُس وقت کی پولیس کی باتیں ہیں جب قانون کا احترام تھا اور پولیس کو سیاست میں استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔ ملزموں کو پکڑنے کے معاملے میں پولیس جنّوں اور چڑیلوں سے بھی نہیں ڈرتی تھی۔ مردان قلندر نے اسی میں اپنی خیریت سمجھی کہ مان جاؤ' نہیں تو یہ لوگ ہڈیاں توڑ دیں گے۔ اس نے ہاتھ جوڑ دیے اور دو گواہوں کے سامنے ایک سوٹ کیس سے زیورات نکال دیے۔

اس کے ساتھ جو تین آدمی تھے وہ اس علاقے کے بدمعاش تھے اور جُواء کھیل رہے تھے۔ تاش اور کچھ رقم سامنے پڑی تھی۔ یہ قبضے میں لے لی گئی۔

یہ کارروائی اے ایس آئی کر چکا تھا اور گھر کی تلاشی بھی لے چکا تھا۔ اس نے مجھ کو سنایا کہ جب نیچے تلاشی ہو رہی تھی تو اوپر چھت پر قدموں کی دھمک سنائی دی۔ صحن میں کھڑے ایک کانسٹیبل کو اوپر ایک آدمی نظر آیا جو فوراً پیچھے ہٹ گیا۔ کانسٹیبل نے ہیڈ کانسٹیبل کو بلایا اور بتایا۔ وہ دوڑتے ہوئے سیڑھیاں چڑھے اور اوپر گئے۔

دو آدمی پچھواڑے کی منڈیر سے نیچے کو کُودنے یا اُترنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہیڈ کانسٹیبل نے ان کو للکارا کہ انہوں نے بھاگنے کی کوشش کی تو ان کو گولی مار دی جائے گی۔ وہ رُک گئے۔ ایک کمرے میں روشنی تھی۔ وہاں گئے تو شاہدہ کھڑی تھی۔ پولیس کو دیکھ کر اس نے رونا شروع کر دیا اور بتایا کہ ان آدمیوں نے اس کو زبردستی اٹھایا تھا اور آج تیسری رات ہے کہ یہ سب اُس کو خراب کر رہے ہیں۔

اے ایس آئی نے مجھ کو اطلاع بھیجی اور میں پہنچ گیا۔ دو گواہ شہر سے ساتھ لائے تھے' میں نے دو گواہ اس گاؤں کے لے لئے۔ لڑکی اور دیگر اشیاء کی برآمدگی کے مشیرنامے تحریر کر کے نشاندہی کرنے والوں کے اور گواہوں کے انگوٹھے لگوائے اور تمام افراد کو جو اس مکان میں تھے' تھانے لے گئے۔ تھانے میں ایک چیز اور بھی ساتھ آئی۔ یہ شاہدہ کی سینڈل کا دوسرا پاؤں تھا۔ یہ بالکل اس پاؤں جیسا تھا جو میرے قبضے میں تھا۔ میں نے شاہدہ کے بازوؤں میں چوڑیاں دیکھیں۔ یہ ٹوٹنے سے بچ گئی تھیں۔ چوڑیوں کے جو ٹکڑے میرے پاس تھے وہ ایسی ہی چوڑیوں کے تھے۔

لہراسب ابھی تھانے میں ہی تھا اور بہت پریشان تھا۔ اُس کو ابھی میں چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ ابھی شاہدہ اور اس کے اغوا کے ملزموں کے بیان لینے تھے۔ ہو سکتا تھا یہ واردات لہراسب نے ہی انتقاماً" کروائی ہو۔

میں نے اُس رات سونا نہیں تھا۔ سب سے پہلے شاہدہ کو بیان کے واسطے اپنے پاس بٹھایا۔ اس کا تو رو رو کر بُرا حال ہو رہا تھا۔ اس کا ڈاکٹری معائنہ کرانا تھا جو اگلے روز ہو سکتا تھا۔ اس نے جو بیان دیا وہ اس طرح تھا کہ طلاق کے بعد بھی وہ آصف سے ملتی رہتی تھی۔ ملاقات اس طرح ہوتی تھی کہ آصف شام کے بعد شاہدہ کے گاؤں کے قریب ایک جگہ چلا جاتا اور شاہدہ آجاتی تھی۔

وقوعہ کی رات کی واردات شاہدہ نے اس طرح سنائی کہ آصف کے ساتھ ایسی ہی ایک ملاقات کا وعدہ تھا۔ شاہدہ نے گھر سہیلی کے گھر جانے کا بتایا۔ پہلے سہیلی کے گھر گئی تا کہ سچّی ہو جائے کہ سہیلی کے گھر ہی گئی تھی۔ وہاں سے وہ ملاقات والی جگہ گئی جو کھیتوں میں تھی۔

آصف آیا ہُوا تھا۔ اس کے ساتھ وہ پیار محبت کی باتیں کر رہی تھی کہ تین آدمی اچانک آ گئے۔ ان کے ہاتھوں میں کلہاڑیاں تھیں۔ ایک نے آصف

کو کہا کہ تم شہر سے آئے ہو اور تمہارے ساتھ ہماری کوئی دشمنی نہیں۔ تم چُپ کر کے چلے جاؤ اور زبان بند رکھنا۔ یہ لڑکی ہمارے ساتھ جائے گی۔

یہ کہہ کر انہوں نے شاہدہ کو پکڑا اور کہا کہ خاموشی سے ہمارے ساتھ چلی جاؤ' نہیں تو اُدھر ہی تم کو خراب کریں گے پھر قتل کر دیں گے۔

ایک چاقو تین کلہاڑیاں

آصف غصے والا آدمی تھا۔ اس نے یہ بھی سوچا ہو گا کہ شاہدہ یہ نہ سمجھے کہ آصف بے غیرت ہے اور اُس کو تین آدمیوں کے حوالے کر گیا ہے۔ آصف نے چاقو نکالا اور ان آدمیوں کو کہا کہ لڑکی کو چھوڑ دو اور تینوں میرے مقابلے میں آؤ۔

آصف نے اس آدمی پر حملہ کیا جس نے شاہدہ کو پکڑا ہُوا تھا۔

"او دیکھو اوئے" —— اس آدمی نے کہا —— "اس کے ہاتھ میں چاقو ہے۔ مارو اسے!"

ایک آدمی آصف کے پیچھے تھا۔ اس نے آصف کو کلہاڑی ماری جو اس کی گردن کے قریب لگی۔ آصف نے گھوم کر اس آدمی کو چاقو مارنے کی کوشش کی لیکن دو آدمیوں نے اس کو کلہاڑیاں ماریں۔ سر پر بھی ماریں۔ آصف گر پڑا۔

ان تینوں نے شاہدہ کو ڈرایا کہ اس کا بھی یہی انجام ہو گا۔ وہ اتنی خوفزدہ ہوئی کہ اس میں بولنے کی بھی طاقت نہ رہی۔ وہ اُن کے ساتھ چل پڑی۔ دو تین کھیت آگے جا کر شاہدہ کو اچانک جوش آ گیا۔ اس نے آگے جانے سے انکار کر دیا۔ تینوں اس کو پکڑ کے گھسیٹنے اور دھکیلنے لگے۔ وہ فصل میں چلی گئی تھی۔ اس دھینگا مشتی اور زبردستی میں شاہدہ کی چوڑیاں ٹوٹیں۔ ایک آدمی نے شاہدہ

کو کندھے پر اس طرح ڈال لیا کہ اس کا اوپر کا دھڑ اُس کی پیٹھ کے پیچھے اور ٹانگیں آگے تھیں۔ اس موقع پر اس کی سینڈل کا ایک پاؤں فصل میں گر پڑا۔

شاہدہ کو مردان قلندر کے گھر لے گئے۔ مردان قلندر نے اس طرح بات کی جیسے اس کو پہلے سے معلوم تھا کہ ایک لڑکی کو لایا جائے گا۔

"لے آئے بھائی!" — اُس نے کہا اور شاہدہ کو دیکھ کر بولا — "واہ بھئی واہ! کیا چیز لائے ہو۔ یہ تو تازہ مال ہے"۔

اُس کو اوپر کے کمرے میں لے گئے۔ وہ رات' اگلا دن پھر ایک رات اور ایک دن یہ تین آدمی اور مردان قلندر شاہدہ کو مسلسل خراب کرتے رہے۔

شاہدہ تینوں کو پہچانتی تھی۔ یہ اُس کے اپنے گاؤں کے آدمی تھے۔ دن کے وقت یہ تینوں چلے جاتے تھے۔ مختصر یہ کہ شاہدہ اس کمرے میں قید رہی۔ اُس کو زبردستی شراب بھی پلائی جاتی تھی۔

میں شاہدہ کے بیان پر حیران ہو رہا تھا کہ یہ تینوں آدمی اس کے اپنے گاؤں کے تھے اور اس سے اپنے چہرے چھپا نہیں رہے تھے۔ مردان قلندر نے بھی اپنی شناخت کا کوئی خطرہ محسوس نہ کیا۔ یہ راز ملزموں کے بیانوں سے کھلا۔

میں نے شاہدہ کو اغوا اور آصف کو قتل کرنے والے تینوں ملزموں کو الگ الگ اپنے پاس بلایا اور ہر ایک کو جھانسہ دیا کہ میں اس کو وعدہ معاف گواہ بنا رہا ہوں۔ ہر ایک نے اقبالی بیان دے دیا۔ مردان قلندر کو میں نے ایسا لالچ نہیں دیا۔ اُس پر مجھ کو بہت زیادہ غصہ تھا۔ میں نے اے ایس آئی کو بلایا۔

"اس کافر قلندر سے تم بیان لو" — میں نے اے ایس آئی کو کہا — "لیکن اس کو اتنی پھینٹی لگاؤ اور اتنا ذلیل کرو کہ اس کو ہوش نہ رہے"۔

اے ایس آئی نے یہ کام شروع کر دیا۔

دوسرے ملزموں سے جو بیان لیے' اُن سے یہ راز کھلا کہ ان میں بڑی عمر

کا جو آدمی تھا' یہ اس نے انتقامی کارروائی کی تھی۔ اُس کا نام نظام دین تھا اور اسے جامو کہتے تھے۔ اس کی عمر چالیس سے ڈیڑھ دو سال کم تھی۔ اُس کی عمر تئیس چوبیس سال تھی تو اس نے ایک آدمی کو قتل کر دیا تھا۔ یہ فطرتاً" لڑاکا تھا اور لڑائیاں جھگڑے ہی کرتا رہتا تھا۔ ہر کسی پر رعب جھاڑتا اور اپنے آپ کو کِنگ کانگ سمجھتا تھا۔

وہ قتل کے جرم میں پکڑا گیا۔ عینی شاہد صرف ایک آدمی تھا۔ وہ تھا شاہدہ کا باپ۔ اُس نے پولیس کو بیان دے دیا۔ جامو کا باپ شاہدہ کے باپ کو کہنے لگا کہ وہ عدالت میں بیان دینے نہ جائے۔ اس کی گواہی کے بغیر جرم ثابت ہو ہی نہیں سکتا تھا لیکن شاہدہ کا باپ نہیں مانتا تھا۔ اس کو اچھی خاصی رقم پیش کی گئی جو اُس نے قبول نہ کی۔

ایک بات جو مجھ کو بعد میں شاہدہ کے گاؤں کے نمبردار سے پتہ لگی تھی وہ میں یہیں بتا دیتا ہوں۔ شاہدہ کے باپ نے مقتول کے باپ سے بہت رقم وصول کر لی تھی۔ اُس کے علاوہ اس نے تھانے دار کو بھی خوش رکھنا تھا۔

اُس کو جامو کے رشتہ دار کہتے رہے کہ وہ عدالت میں گواہی نہ دے لیکن اس شخص نے خود بھی گواہی دی اور تھانیدار کے کہنے پر وہ ایک جھوٹا گواہ بھی تیار کر کے لے گیا۔ یہی دو گواہ اہم تھے۔ جامو کو عمر قید کی سزا ہو گئی۔ عمر قید کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ساری عمر جیل میں رہنا پڑتا ہے۔ جامو معافیاں وغیرہ ملا کر تیرہ سال اور کچھ مہینے قید کاٹ کر واپس آ گیا۔ اس کو آئے ہوئے بیس بائیس دن ہوئے تھے اور وہ ہر وقت انتقام کے طریقے سوچتا رہتا تھا۔ وہ یہ تو سوچتا ہی نہیں تھا کہ اُس نے ایک آدمی کو قتل کیا اور سزا پائی تھی۔

"جناب تھانیدار صاحب!" — جامو نے بیان دیتے ہوئے کہا — "مجھ کو

صرف قید کی سزا نہیں ملی۔ یہ بھی دیکھیں کہ میں جوانی کی عمر میں جیل میں گیا تھا اور باہر آیا تو میں بڑھاپے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ سب سے بڑا نقصان یہ ہُوا کہ میری قید کے دوران میری بیوی نے دو آدمیوں کے ساتھ تعلقات پیدا کر لیے۔ میں نے کہا کہ اس کا کیا قصور ہے۔ یہ نوجوان تھی اور میں ایک آدمی کو قتل کر کے جیل چلا گیا۔ میں نے اُس کو طلاق دے دی ہے۔ بڑی خوبصورت عورت ہے اور مجھ کو اس کے ساتھ دِلی محبت تھی۔ میرے دل کو چوٹیں پڑتی ہیں"۔

جیل میں جامو کو بڑے پکّے بدمعاش اور عادی مجرم مل گئے تھے۔ انہوں نے اس کو بھی مجرم اور غنڈہ بنا دیا۔ گاؤں میں آکر اس کے دماغ میں ایک ہی بات آتی تھی کہ شاہدہ کے باپ کو قتل کرنا ہے۔ کبھی سوچتا کہ اس کے دونوں بیٹوں کو قتل کر دوں گا۔ یہ جو دو جوان آدمی اس کے ساتھ پکڑے گئے تھے' اس کے قریبی رشتہ دار تھے اور ہمراز بھی۔

آصف کی موت اور شاہدہ کی مصیبت آگئی۔ وقوعہ کی رات جامو نے شاہدہ کو کھیتوں کی طرف جاتے دیکھ لیا۔ وہ دوڑ کر ان دونوں آدمیوں کو بلا لایا اور ان کو بتایا کہ شاہدہ کھیتوں کی طرف گئی ہے۔ چلو چلیں۔ تینوں کلہاڑیاں لے آئے اور چھپ چھپ کر وہاں پہنچ گئے جہاں شاہدہ اور آصف موجود تھے۔ وہاں جو وقوعہ ہُوا وہ بیان ہو چکا ہے۔

مروان قلندر کے ساتھ جامو کا دوستانہ تھا۔ جامو وہاں جُوئے اور شراب کے واسطے جاتا تھا۔ یہ جب شاہدہ کو لے جا رہے تھے تو جامو دوڑتا ہُوا مروان قلندر کے گھر چلا گیا اور اس کو بتایا کہ ایک لڑکی کو لا رہے ہیں۔ مروان قلندر بہت خوش ہوا تھا۔

"تم نے یہ نہیں سوچا کہ لڑکی تم کو پہچانتی ہے"—— میں نے پوچھا۔

"سوچا کیوں نہیں تھا"—— جامو نے جواب دیا—— "لڑکی کو ہم نے واپس نہیں کرنا تھا۔ کل رات اُس کا گلا گھونٹ کر رات کو لاش کہیں دفن کر دینی تھی۔ ہم آج ہی رات یہ کام کر دیتے لیکن مروان قلندر کہتا تھا کہ دو تین دن اور رہنے دو"۔

میں نے مقدمہ تیار کیا۔ جامو اور اُس کے دونوں ساتھیوں کو سزائے موت دی گئی اور مروان قلندر کو مجموعی طور پر آٹھ سال سزائے قید دی گئی۔ ہائی کورٹ نے ان کی اپیلیں مسترد کر دیں۔

☆ ☆ ☆

قتل، قاتل اور کارپورل

قتل اور خون خرابے ہوتے ہی رہتے ہیں۔ جب سے انسان پیدا ہُوا ہے' انسان کے ہاتھوں قتل ہو رہا ہے۔ بعض قتل ایسے ہوتے ہیں جن کے پیچھے ایک موٹی کتاب جتنی لمبی کہانی ہوتی ہے۔ یہ واردات جو میں سنانے لگا ہوں' اس کی کہانی کم سے کم اڑھائی سو صفحوں کی کتاب کے واسطے لکھنے کی کہانی ہے اور یہ اس معاشرے کی کہانی ہے جس میں ہم اور آپ پیدا ہوئے اور زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ معاشرہ آپ کے واسطے غیر اور اجنبی نہیں۔ یہ سو فیصد سچی داستان جن لوگوں کے روّیے اور بداعمالیوں سے بنی تھی' ان لوگوں کو بھی آپ پہچانتے ہیں۔ ایسے لوگ ہمارے معاشرے میں ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔

ضروری بات یہ ہے کہ یہ واقعہ' بلکہ واقعات کا مجموعہ' اس علاقے کا ہے جو بعد میں پاکستان کا علاقہ بن گیا تھا۔ پاکستان تقریباً" ساڑھے تین سال بعد وجود میں آیا تھا۔ پاکستانی علاقے کی واردات ہونے کی وجہ سے میں واردات والے قصبے کا نام نہیں لکھوں گا نہ میں کسی مرد یا عورت کا صحیح نام لکھوں گا۔ نام جو لکھوں گا یہ فرضی ہوں گے۔ یہ احتیاط اس وجہ سے ضروری ہے کہ میں کسی کی بدنامی اور دل آزاری نہیں کرنا چاہتا۔ ۱۹۴۷ء میں میری ایک ٹانگ مشرقی پنجاب میں سکھوں نے توڑ دی تھی جو پاکستان میں آکر کٹوانی پڑی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس بڑھاپے میں کوئی پاکستانی جاگیردار دوسری ٹانگ توڑ دے۔

اب اصل بات سنیں۔ یہ ایک قصبہ تھا جو پاکستان میں آگیا تھا۔ میں اس کے تھانے کا انچارج تھا۔ علاقہ میدانی نہیں بلکہ گھاٹیوں' ٹیلوں اور کھڈ نالوں والا تھا۔ اس زمانے میں اس کے بعض حصے تو بالکل ہی بنجر اور ویران تھے جہاں زمین کٹی پھٹی اور گہرے کھڈوں والی تھی۔ یہ اس قصبے کے اِردگرِد دیہاتی علاقہ تھا۔ اس کا بہت سا حصہ میرے تھانے میں آتا تھا۔

ایک روز تقریباً" تین بجے بعد دوپہر ایک معزّز آدمی تھانے میں آیا۔ میں آپ کو مزے کی ایک بات بتاتا ہوں کہ جب پولیس والے کسی کو معزّز آدمی کہتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ شریف آدمی ہے۔ سرکاری طور پر معزّز کا مطلب ہوتا ہے کہ وہ ذرا اونچی حیثیت والا آدمی ہے' زمین جائیداد والا ہے اور بڑے اچھے کپڑے پہنتا ہے۔ شہروں اور قصبوں کے اکثر معزّز حضرات پولیس کے مخبر ہوتے ہیں۔ اگر اُن کو چغل خور کہا جائے تو یہ ٹھیک لفظ ہے۔

اس معزّز آدمی کو میں جانتا تھا جس کا ذکر کیا ہے کہ بعد دوپہر تھانے میں آیا۔ میں سمجھا شاید رسمی سلام دعا کے لئے آیا ہے۔ لیکن وہ بڑی پریشانی لے کر آیا تھا۔ اُس کا جوان بیٹا لاپتہ ہو گیا تھا۔ میں نے اس کے بیٹے کی عمر پوچھی تو اس نے چھبیس سال کے قریب بتائی اور وہ غیر شادی شدہ تھا۔

مجھ کو پہلا خیال یہ آیا کہ اس کا بیٹا خود ہی کہیں چلا گیا ہو گا۔ یہ خیال اس وجہ سے آیا تھا کہ اس بیٹے کا باپ امیر زمیندار تھا۔ قصبے کے قریب اس کی بہت سی زمین تھی اور نہری علاقے میں اس کے باپ دادے کے تین چار مربعے بھی تھے۔ قصبے میں اُس کی کمشن ایجنسی بھی تھی۔ اس قسم کے مالدار آدمیوں کی اولاد ایسی ہی ہوتی تھی کہ اخلاق اچھا نہیں ہوتا تھا۔ یہ شخص انگریزوں کو اپنا آقا سمجھتا تھا۔ میں اس کی بابت اتنا ہی جانتا تھا کہ اُس کا شمار قصبے کے چند ایک بڑے آدمیوں میں ہوتا ہے۔ قصبے کے رئیس تو ہندو اور سکھ تھے جن کے

ہاتھوں میں تجارت تھی۔ مسلمانوں کی مالی حالت کمزور تھی۔ اُن میں یہ شخص سرکردہ تھا۔

اس شخص کی بابت میں یہ بھی جانتا تھا کہ قصبے کے تین چار بدمعاش اس کے مرید ہیں۔ تین سال پہلے جب یہاں کوئی اور تھانیدار تھا' یہ شخص ایک آدمی کے قتل میں ملّوث پایا گیا تھا لیکن عدم ثبوت کی بنا پر گرفتار ہی نہیں ہو سکا تھا۔ سب کہتے تھے کہ رشوت چل گئی تھی۔

میں اس کے گھریلو حالات سے واقف نہیں تھا۔ اس کا نام جو کچھ بھی تھا اُس کو جانے دیں' میں اُس کو خواجہ لکھوں گا اور اس کے بیٹے کا فرضی نام بشیر رکھ لیتا ہوں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس کو یہ خیال کیوں آیا ہے کہ اس کا بیٹا لاپتہ ہو گیا ہے؟ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سیر سپاٹے کے واسطے کہیں چلا گیا ہو!

"مجھ کو بتائے بغیر اس طرح گھر سے کبھی غیر حاضر نہیں ہوا"——— اس نے جواب دیا——"وہ پرسوں دوپہر سے غائب ہے۔ اگر مجھ کو بتائے بغیر ہی اس نے سیر سپاٹے کے لئے جانا تھا تو ایک دو جوڑے کپڑے وغیرہ ساتھ لے جاتا"۔

"اُس نے ماں کو بھی کچھ نہیں بتایا؟"

"نہیں!"——اس نے جواب دیا——"اُس کی اپنی ماں تو تین سال گزرے فوت ہو گئی ہے۔ اب اُس کی ماں سوتیلی ہے"۔

"پھر تو معاملہ صاف ہے"——میں نے کہا——"آپ کا بیٹا گھر سے بھاگ گیا ہے۔ یہ ہمارے گھروں کی بڑی پرانی کہانی ہے۔ دوسری بیویاں خاوندوں کی پہلی بیویوں کی اولاد کے ساتھ بہت بُرا سلوک کرتی ہیں۔ لڑکیاں بے چاری بھاگ نہیں سکتیں۔ لڑکے گھروں سے بھاگ جاتے ہیں .... مربعوں پر نہ چلا گیا ہو!"

"وہاں میں نے پرسوں ہی ایک آدمی کو بھیج دیا تھا"— خواجہ نے جواب دیا— "اُس نے وہاں سے بذریعہ تار اطلاع دی ہے کہ بشیر وہاں نہیں گیا.... میں آپ کو یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ اس کے ساتھ اس کی سوتیلی ماں کا سلوک بہت اچھا تھا"۔

"کیا آپ کو کسی پر شک ہے؟"— میں نے پوچھا— "ہو سکتا ہے اس کو آپ کے کسی دشمن نے اغوا کرایا ہو"۔

"میری کسی کے ساتھ ایسی دشمنی نہیں"— اس نے جواب دیا۔

"آپ کے بیٹے کی ہو گی"— میں نے کہا— "اگر آپ نہیں جانتے تو بیٹے کے دوستوں سے پوچھا ہو گا"۔

"ابھی ان سے انکوائری نہیں کی"— خواجہ نے کہا— "اتنا ہی پوچھا تھا کہ کسی کو معلوم ہو کہ وہ کہاں گیا ہے تو مجھ کو بتا دے لیکن اس کے کسی دوست کو علم نہیں۔ اب ان سے پوچھوں گا کہ بشیر کی کسی کے ساتھ ذاتی دشمنی تو نہیں تھی؟"

"خواجہ صاحب!"— میں نے کہا— "میں ایک بات پوچھوں گا لیکن آپ صحیح جواب نہیں دیں گے.... کوئی باپ یہ نہیں مانتا کہ اس کے بیٹے یا بیٹی کا اخلاق اور چال چلن ٹھیک نہیں۔ بیٹا اکلوتا ہو اور باپ امیر بھی ہو اور اس کے ہاتھ میں غنڈے بدمعاش بھی ہوں تو بیٹا اچھے چال چلن کا ہو ہی نہیں سکتا"۔

"میں اپنے بیٹے کے چال چلن کی تعریف نہیں کروں گا"— خواجہ نے کہا — "ماں نے اس کو بہت بگاڑ دیا تھا۔ اس نے صرف دس جماعتیں پاس کی ہیں۔ میرا ارادہ تھا کہ اس کو آگے پڑھاؤں گا۔ وہ زمانہ گزر گیا ہے جب دس جماعتوں کو بہت زیادہ تعلیم سمجھا جاتا تھا۔ اب لڑکے کو کم از کم بی اے ہونا

چاہیے"۔

"تعلیم کو چھوڑیں خواجہ صاحب!"— میں نے اُس کی بات کو مختصر کرنے کی نیّت سے کہا— "بیٹے کے چال چلن کی بات کریں۔ میں نے یہ دیکھنا ہے کہ وہ خود کہیں چلا گیا ہے یا کسی دشمن کی انتقامی کارروائی کا شکار ہو گیا ہے"۔

اُس نے اپنے بیٹے کا چال چلن تو بیان کر دیا لیکن کوئی ایسا سنگین اور شدید نقص نہ بتایا جو کسی کی دشمنی کا باعث بنتا ہو۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کی بدچلنی پر پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن میری مجبوری یہ تھی کہ میں نے اُس کے بیٹے کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرنی تھی۔ میرے دماغ میں یہی ایک شک تھا کہ اس کا لاڈلا بیٹا سوتیلی ماں کے سلوک سے تنگ آ کر بھاگ گیا ہے۔

"ایک بات بتا دیں خواجہ صاحب!"— میں نے کہا— "آپ نے یہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی ہو گی کہ آپ کے بیٹے کا کوئی دوست بھی گھر سے غیر حاضر ہو گا یا کسی کی لڑکی لاپتہ ہو گئی ہو گی"۔

"اس کے دوستوں کو میں جانتا ہوں"— اُس نے کہا— "وہ سب یہیں ہیں اور کسی کی لڑکی کی بابت میں کچھ نہیں جانتا"۔

میں نے لڑکے کا حلیہ وغیرہ لکھ لیا۔ خواجہ اس کا ایک فوٹو ساتھ لایا تھا۔ وہ بھی رکھ لیا اور جو کاغذی کارروائی کرنی تھی وہ کر لی اور خواجہ سے کہا کہ وہ اپنے طور پر بھی سراغرسانی کرتا رہے۔

سوتیلی ماں اور جوان بیٹا

یہ سلسلہ آج کل بھی چلتا ہے کہ میں نے پہلے جن معزّزین کا ذکر کیا ہے وہ تھانیدار کے سلام کے لئے باری باری تھانے آتے ہیں۔ ہمارے وقتوں میں یعنی انگریزوں کی حکومت میں یہ سلسلہ زیادہ چلتا تھا۔ اس وقت تھانیدار اپنا

رعب داب رکھتے تھے اور اُن کا کردار ایسا تھا کہ لوگ ان سے ڈرتے اور اُن کی عزت کرتے تھے۔ میں جن معززین کا ذکر کر رہا ہوں یہ دراصل پولیس کے چمچے ہوتے ہیں۔

خواجہ تھانے سے چلا گیا تو تھوڑی ہی دیر بعد اس کے محلے کا اسی جیسا ایک معزز آدمی آ گیا۔ میں نے اُسے آتے دیکھا تو میں سمجھ گیا کہ یہ شخص خواجہ کے بیٹے کی گمشدگی کے سلسلے میں ہی آیا ہے۔ مجھ کو یہ بھی معلوم تھا کہ یہ شخص خواجہ کے حق میں کوئی بات نہیں کرے گا بلکہ اس کے خلاف ہی کچھ باتیں بتائے گا۔ ایسے لوگ اور ان کی اس قسم کی باتیں تفتیش میں بڑی کار آمد ثابت ہوا کرتی تھیں۔ اگر وہ نہ آتا تو میں نے اُس قسم کے ایک دو معزز مخبروں کو بلانا ہی تھا۔ میں نے دراصل خواجہ کے بیٹے کے لاپتہ ہونے کی بیک گراؤنڈ معلوم کرنی تھی۔ مجھ کو یہ تجربہ تھا کہ اس قسم کے امیرزادے اور آوارہ شہزادے خود ہی عیش و عشرت کے واسطے غائب ہو جاتے ہیں اور پولیس خوامخواہ اِدھر اُدھر جھک مارتی پھرتی ہے۔ خواجے کے بیٹے کی عمر چھبیس سال تھی۔ وہ کوئی بچّہ تو نہیں تھا کہ اس کو کوئی اٹھا کر یا ورغلا کر لے گیا ہو گا۔ اگر اس کا باپ یہ کہتا کہ اس کے بیٹے کو فلاں شخص یا فلاں خاندان کے کسی آدمی نے برائے قتل اغوا کیا ہے تو میں اپنی تفتیش کو اس لائن پر لے جا کر دن رات ایک کر دیتا۔

"آیئے شیخ صاحب!"— میں نے ہاتھ اس معزز شخص کی طرف بڑھاتے ہوئے استقبال کیا— "تشریف رکھئے.... ابھی ابھی آپ کے خواجہ صاحب آئے تھے"۔

"ہاں سرکار!"— اس نے کہا— "بیچارہ بہت پریشان ہے.... لیکن جناب عالی! اعمال اپنے ہی خراب ہوں تو اولاد کا کیا قصور۔ باپ نے بیٹے سے بھی سال دو سال کم عمر کی لڑکی کے ساتھ شادی کر لی ہے۔ مجھ کو تو اُسی سلسلے

میں کوئی گڑ بڑ نظر آتی ہے"۔

یہ بات میرے واسطے بالکل نئی اور بہت دلچسپ تھی۔ میں نے شیخ صاحب کو گرمایا کہ وہ خواجے کے گھر کے تمام حالات مجھ کو سنائے۔

اس معزز آدمی نے جو حالات سنائے وہ مختصراً" یہ تھے کہ خواجہ کا ایک تو یہ بیٹا بشیر تھا جس کی عمر چھبیس سال تھی۔ اُس کی دو بیٹیاں تھیں۔ ایک بشیر سے دو تین سال چھوٹی اور دوسری اس سے دو تین سال بڑی تھی۔ دونوں اسی قصبے میں بیاہی ہوئی تھیں۔ ان کی ماں کو فوت ہوئے تین سال ہو گئے تھے۔ خواجہ کی اپنی عمر پچپن اور ساٹھ سال کے درمیان تھی لیکن روپے پیسے کی فراوانی اور زمین جائیداد کی بدولت اپنے آپ کو جوان سمجھتا تھا۔ بیوی کے مرنے کے بعد اس نے ایک نوجوان لڑکی کے ساتھ شادی کر لی تھی۔

میں اس لڑکی کے اصل نام کی بجائے اُس کو عائشہ لکھوں گا۔ مجھ کو اس کی عمر چوبیس پچیس سال بتائی گئی اور یہ بھی بتایا گیا کہ لڑکی خوبصورت ہے۔ وہ اسی عمر میں بیوہ ہو گئی تھی۔ شادی کا ساتواں یا آٹھواں مہینہ تھا کہ اس کا خاوند سیلاب میں ڈوب کر مر گیا۔ میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ یہ کسی دریا کا سیلاب نہیں تھا اور وہاں کوئی دریا تھا ہی نہیں۔ برساتی نالے تھے۔ ساون کے مہینے میں بارش ہوتی تھی تو ان نالوں میں بڑا تیز و تند سیلاب آ جاتا تھا۔ بعض نالوں کے کنارے اونچے اور ان کی چوڑائی تنگ ہوتی تھی۔ اس وجہ سے سیلاب گہرا اور زیادہ خطرناک ہو جاتا تھا۔ اگلے دن سیلاب کا نام و نشان نہیں رہتا تھا۔

عائشہ کا خاوند ایسے ہی ایک برساتی نالے کے اونچے کنارے پر کھڑا سیلاب کا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ بہت تیز بارش برسی تھی جو ختم ہو چکی تھی اور سیلاب بڑا زبردست تھا۔ عائشہ کے خاوند کے ساتھ کچھ آدمی بھی کھڑے تھے۔ عائشہ کے خاوند کو معلوم نہیں کیا سوجھی کہ وہ کنارے سے اور آگے ہو گیا۔ کنارا پتھریلا

ہوتا تو ٹھیک تھا لیکن یہ مٹی کا تھا۔ اُس کا ایک تودہ الگ ہو گیا اور سرک کر پانی میں گر پڑا۔ یہ بد قسمت آدمی اسی تودے پر کھڑا تھا۔ وہ تودے کے ساتھ ہی پانی میں گرا۔

وہاں نالے کا پاٹ تنگ تھا اور نالے کا موڑ بھی تھا' اس وجہ سے وہاں سیلاب کا زور اور جوش زیادہ تھا۔ کنارے پر کھڑے آدمیوں میں خواجہ کا بیٹا بشیر بھی تھا۔ اس نے نالے میں چھلانگ لگا دی۔ اس کا شاید یہ خیال تھا کہ عائشہ کا خاوند تیرنا نہیں جانتا۔ بشیر نے اس کو بچانے کی بہت کوشش کی لیکن عائشہ کا خاوند زندہ نہ نکل سکا۔ بشیر اس کو سیلاب سے تو نکال کر باہر لے آیا لیکن اس کے اندر اتنا زیادہ پانی چلا گیا تھا کہ وہ زندہ نہ رہ سکا۔

اس حادثے کے کچھ مہینوں بعد خواجہ نے عائشہ کے ساتھ شادی کر لی۔

مجھ کو بتایا گیا کہ ذات پات اور آمدنی وغیرہ کے لحاظ سے عائشہ کا خاندان مڈل کلاس تھا۔ یہ بتانے سے میرا مطلب یہ ہے کہ عائشہ کا خاندان خواجہ کی سوشل پوزیشن سے خاصا کم تھا۔

"ایک ضروری بات بتائیں شیخ صاحب!" — میں نے پوچھا — "کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اس نوجوان سوتیلی ماں کا بشیر کے ساتھ کیا رویّہ تھا؟.... رویّہ دو طرح کا ہو سکتا ہے۔ ایک یہ کہ سوتیلی ماں اس کے ساتھ اچھا رویّہ نہیں رکھتی ہو گی۔ دوسرے یہ کہ بشیر جوان اور امیرزادہ تھا' اس نے سوتیلی ماں کی عزت پر ہاتھ ڈالا ہو گا اور تیسری بات یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس نوجوان لڑکی نے بشیر کے ساتھ قابلِ اعتراض تعلق پیدا کرنے کی کوشش کی ہو گی اور بشیر نے اُس کو اپنے باپ کی بیوی سمجھتے ہوئے یہ تعلق قبول نہیں کیا ہو گا"۔

"آپ خود سیانے ہیں حضور!" — شیخ صاحب نے کہا — "عورتوں کی نظر بڑی گہری اور دُور تک جاتی ہے۔ محلے کی عورتیں خواجہ کے گھر آتی جاتی رہتی

ہیں۔ وہ دراصل یہ دیکھنے جاتی ہیں کہ ایک نوجوان لڑکی ایک بوڑھے آدمی کے ساتھ کس طرح نبھا کر رہی ہے.... میری بیوی نے خود بھی دیکھا ہے اور محلّے کی عورتوں سے سنا بھی ہے کہ بشیر جو عام طور پر باہر ہی گھومتا پھرتا رہتا تھا' عائشہ کے آجانے سے بہت کم باہر نکلتا ہے۔ باہر اس وقت نکلتا ہے جب اُس کا باپ گھر میں ہوتا ہے۔ عورتوں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ عائشہ بشیر کا بہت زیادہ خیال رکھتی ہے اور ان دونوں کو ایک ہی چارپائی پر اکٹھے بیٹھے کئی بار دیکھا گیا ہے۔ میں نے اُڑتی اُڑتی سنی ہے کہ خواجہ کو اپنے بیٹے کا یہ رویّہ پسند نہیں"۔

"مجھ کو ایک مشورہ دیں" — میں نے کہا — "اگر میں یہ کہوں کہ بجائے اُس کے کہ سوتیلی ماں کا رویّہ بشیر کے ساتھ خراب ہو یعنی سوتیلی ماؤں جیسا نہ ہو اور باپ کا رویّے بیٹے کے ساتھ بہت بُرا ہو گیا ہو تو کیا میرا یہ شک ٹھیک ہو گا؟"

"ہاں سرکار!" — شیخ نے جواب دیا — آپ کا یہ خیال ٹھیک ہو سکتا ہے۔ اگر آپ صحیح جواب حاصل کرنا چاہتے ہیں تو خواجہ کی بیٹیوں سے پوچھیں۔ میں صرف یہ ناقص رائے دوں گا کہ بشیر کے ساتھ سوتیلی ماں کا رویّہ ٹھیک نہ ہوتا تو وہ گھر سے باہر ہی رہتا۔ یہ بھی سوچیں کہ بشیر اپنے آپ کو بدمعاش سمجھتا ہے۔ جہاں تک اس کو میں جانتا ہوں وہ اپنی عمر کی لڑکی کی کوئی بات برداشت کرنے والا نہیں"۔

"بشیر کیسا آدمی ہے؟" — میں نے پوچھا۔

"شریف آدمی نہیں" — اس نے جواب دیا — "آپ ان امیرزادوں کو جانتے ہی ہیں۔ یہ بھی لڑائی مارکٹائی والی فلموں کا ہیرو ہے"۔

"خواجہ کی یا اس کے بیٹے کی کسی کے ساتھ دشمنی؟"

"بشیر کی دشمنی ہو سکتی ہے کہ یہ لڑکا دوسروں کی بہو بیٹیوں کو چھیڑنے سے

باز نہیں آتا۔ باقی رہا خواجہ' اُس کی بابت میں کہہ سکتا ہوں کہ بہت چالاک اور ملنسار آدمی ہے۔ کسی کے ساتھ دشمنی نہیں رکھتا"۔

"میں نے تو کچھ اور سنا تھا"—— میں نے کہا—— "میرے یہاں آنے سے پہلے قتل کی ایک واردات ہوئی تھی جو' سنا ہے' خواجہ نے کروائی تھی"۔

"وہ معاملہ ذرا شک میں تھا"—— اُس نے جواب دیا—— "لوگ کہتے ہیں کہ وہ آدمی خواجہ نے ہی قتل کروایا تھا لیکن وہ بات تین چار سال پرانی ہو گئی ہے۔ اگر کسی نے خواجہ سے انتقام لینا ہوتا تو وہ اتنا عرصہ انتظار نہ کرتا.... ویسے میں آپ کو بتا دوں سرکار! خواجہ بڑا گہرا آدمی ہے۔ یہ چاہے تو قتل کروا سکتا ہے"۔

اس شخص کے ساتھ بہت سی باتیں ہوئیں اور میں نے اُس کو فارغ کر دیا۔

دو بہنیں

گمشدگی کی جو کاغذی اور دیگر کارروائیاں ہوتی ہیں وہ میں نے اگلے روز تھانے میں آکر مکمل کر دیں لیکن معلوم نہیں کیوں میرے دماغ میں یہ بات اٹکی رہی کہ خواجہ کا بیٹا اغوا یا لاپتہ نہیں ہُوا۔ وہ خود گیا ہے یا یہ کوئی اور معاملہ ہے۔ اس شخص نے جس کو میں نے شیخ صاحب لکھا ہے' مجھ کو ایسی باتیں بتائی تھیں جو میرے شک کو مضبوط کرتی تھیں۔ میں نے ضرورت محسوس کی کہ بشیر کی بہنوں اور بہنوئیوں سے پوچھ لیا جائے کہ خواجہ کے گھر کے حالات کیسے تھے۔

میں نے بشیر کی بہنوں کے خاوندوں کو بلا لیا۔ اس کے علاوہ میں نے اپنے ضروری مخبروں کو بھی طلب کیا تھا۔ انہوں نے ابھی میرے پاس آنا تھا۔

خواجہ کے دونوں داماد جلدی پہنچ گئے۔ میں نے اُن سے الگ الگ تفتیش کی۔ دونوں نے ایک ہی جیسے بیان دئے۔ بڑے داماد نے یہ مشورہ دیا کہ بہتر یہ ہو گا کہ وہ دونوں اپنی بیویوں کو بھی ساتھ لے آئیں۔ اس سے ایک تو اُن دونوں کے بیانات کی تصدیق ہو جائے گی اور ہو سکتا ہے کہ بشیر کی بہنیں کوئی نئی بات بھی بتا دیں۔

مجھ کو یہ مشورہ پسند آیا اور میں نے انہیں کہا کہ وہ اپنی بیویوں کو لے آئیں۔ مجھ کو یہ دونوں آدمی عقلمند لگتے تھے۔ اُن کی باتوں سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ یہ دونوں خواجہ کو اور عائشہ کو اچھا نہیں سمجھتے۔

دونوں اپنی بیویوں کو لے آئے۔ میں نے بڑی بہن سے کہا کہ وہ میرے پاس بیٹھی رہے اور باقی سب باہر چلے جائیں۔

"کیا آپ میری ایک بات مانیں گے!"—— چھوٹی بہن نے کہا—— "کیا یہ ٹھیک نہیں رہے گا کہ ہم دونوں بہنیں اکٹھی بیٹھ کر بیان دیں؟ ہم دونوں کے بیان ایک جیسے ہی ہوں"۔

دراصل یہ طریقہ ٹھیک نہیں تھا لیکن میں نے ان دونوں بہنوں کے طور طریقے اور انداز سے محسوس کر لیا تھا کہ یہ دونوں جھوٹ نہیں بولیں گی۔ میں نے اُن کو اکٹھا ہی بٹھا لیا اور اُن کے خاوندوں کو باہر بھیج دیا۔

"اب بتائیں آپ نے کیا پوچھنا ہے"—— چھوٹی بہن نے کہا۔

"کیا تم نہیں جانتیں کہ تمہارا بھائی لاپتہ ہو گیا ہے؟"—— میں نے کہا—— "میں نے اس معاملے میں تم دونوں سے کچھ پوچھنا ہے.... پہلی بات تو میں نے یہ پوچھنی ہے کہ تمہارا بھائی بشیر کہاں چلا گیا ہے۔ آپ کے ابّا جان کہتے ہیں کہ وہ لاپتہ ہے"۔

دونوں بہنوں نے ایک دوسری کی طرف دیکھا۔ چھوٹی نے بڑی بہن کو کہا

کہ وہ بات کرے۔

"چھپانا کچھ نہیں آپا!" — چھوٹی بہن نے کہا — "ایسے باپ پر کیا پردہ ڈالنا جس کو اپنی اولاد کی بھی ہوش نہیں" — اس نے میری طرف دیکھا اور مجھ کو کہا — "ہمارا اکلوتا بھائی گم ہو گیا ہے جی! آپ نہیں جانتے کہ اس کے ساتھ ہم بہنوں کو کتنا پیار ہے۔ وہ روزانہ باری باری ہمارے گھروں میں آتا ہے" — وہ اس سے آگے نہ بول سکی۔ اُس کو ہچکی سی آئی اور اتنی روئی کہ بڑی بہن نے اس کو دلاسہ دیا۔

میں نے بھی اس کو تسلّیاں دیں کہ اس کا بھائی مل جائے گا۔ دونوں بہنوں کے ساتھ اُن کے بھائی اور باپ کی بابت باتیں ہوئیں تو مجھ کو پتہ لگا کہ ان بہنوں کے دلوں میں بھائی کی محبت بہت ہی زیادہ ہے اور ان کو اپنا باپ اچھا نہیں لگتا۔ دونوں لڑکیاں اونچی ذات کی تھیں' امیر باپ کی بیٹیاں تھیں اور اُن کے سُسرال اور خاوند بھی اچھی پوزیشن والے تھے لیکن ان لڑکیوں میں وہ شوبازی اور گھٹیا پن نہیں تھا جو اس پوزیشن والے خاندانوں کے لڑکوں اور لڑکیوں میں پایا جاتا ہے۔

یہ دونوں بہنیں آج بھی مجھ کو اپنے سامنے بیٹھی نظر آ رہی ہیں۔ انہوں نے میرے آگے بڑا ہی عجیب انکشاف کیا جس کو میں ایک دلچسپ ڈرامہ کہوں گا۔

"اگر میں کہوں کہ باپ نے خود ہی اپنے بیٹے کو غائب کر دیا ہے تو آپ کو یقین نہیں آئے گا" — بڑی بہن نے کہا۔

"ہاں!" — میں نے کہا — "مجھ کو بالکل یقین نہیں آئے گا۔ کیا تم یہ بات یقین کے ساتھ کہتی ہو؟"

"یہ فیصلہ آپ نے کرنا ہے" — بڑی بہن نے جواب دیا — "سنا ہے

تھانیدار زمین کے نیچے سے بھی راز نکال لیا کرتے ہیں"۔

"تم کچھ بتاؤ تو میں راز نکال لوں گا" — میں نے کہا۔

"ہمارا باپ عیّاش آدمی ہے" — بڑی بہن نے کہا — "اُس کا ثبوت آپ کے سامنے ہے۔ اس بڑھاپے میں ہم سے بھی چھوٹی عمر کی لڑکی کے ساتھ اس نے شادی کی ہے۔ شراب پیتا ہے۔ شہر جا کر عیش و عشرت کرتا ہے۔ اس کی ایک بیٹھک الگ ہے۔ اس کمرے میں جب بیٹھتا ہے تو گھر کا کوئی فرد اس کمرے میں جانے کی جرأت نہیں کرتا۔ یہ کمرہ اس کے بدمعاشوں کے واسطے ہے یا بدمعاش عورتوں کے واسطے"۔

"ہماری ماں کو تو اس نے زر خرید لونڈی بنا کر رکھا ہُوا تھا" — چھوٹی بہن نے کہا — "لیکن ہماری ماں کو وہ روپے پیسے کی یا ضرورت کی دوسری چیزوں کی تنگی نہیں دیتا تھا۔ ہماری ماں گھر کی ملکہ تھی۔ سیاہ و سفید کی مالک تھی۔ اس کا حکم چلتا تھا لیکن ہمارے باپ کی پرائیویٹ زندگی میں دخل دینے کا اس کو حق حاصل نہیں تھا.... آگے تم بتاؤ آپا!"

"اصل بات یہ ہے بھائی جی!" — بڑی بہن نے کہا — "ہمارا بھائی اس لڑکی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا جو ہمارے باپ ....کی بیوی بنی ہوئی ہے۔ اس کا نام عائشہ ہے۔ اس کی جب پہلی شادی بھی نہیں ہوئی تھی تو بشیر نے ہم دونوں سے کہا تھا کہ وہ عائشہ کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔ میں نے عائشہ کے ساتھ بات کی تھی۔ اُس نے کہا تھا کہ وہ بشیر کو اتنا زیادہ چاہتی ہے کہ کسی اور کے ساتھ اس کی شادی ہو گئی تو وہ خاوند کو زہر دے دے گی یا خود زہر کھا لے گی"۔

"یہ آپس میں ملتے ملاتے ہوں گے؟" — میں نے کہا۔

"زیادہ نہیں" — اُس نے کہا — "یا چُھپ چُھپ کر نہیں۔ عائشہ کبھی

میرے گھر یا اس بہن کے گھر آجاتی اور بشیر بھی آجاتا تھا۔ ہمارے پاس بیٹھ کر ہی باتیں اور ہنسی مذاق کرلیا کرتے تھے"۔

"پھر ان کی شادی کیوں نہ ہوئی؟" —— میں نے پوچھا۔

"یہ ہماری امّی کی وفات کے بعد کی بات ہے" —— بڑی بہن نے جواب دیا —— "میں نے ایک روز ابّو سے کہا کہ وہ اجازت دیں تو میں بشیر کے لئے عائشہ کا رشتہ مانگنے جاؤں۔ ابو نے مجھ کو ڈانٹ کر کہا کہ تم کو معلوم ہے کہ عائشہ کی ذات کیا ہے' اور وہ لوگ ہماری برابری کرنے کے قابل نہیں۔ ہمارے مقابلے میں ان کی حیثیت چھوٹی ہے۔ میں بشیر کا رشتہ خود دیکھ رہا ہوں....

"ابو نے مجھ کو سختی سے منع کر دیا۔ بشیر نے ایک روز خود ابو کے ساتھ بات کی تو ابو نے اس کو بھی ڈانٹ دیا۔ اتنے میں عائشہ کی شادی ان کی اپنی ذات برادری کے ایک لڑکے کے ساتھ ہو گئی۔ بشیر ہمارے پاس آتا اور روتا تھا۔ ہم اس کو بہلاتی اور کہتی تھیں کہ اس کی قسمت میں عائشہ نہیں تھی"۔

"ہم نے اس کو دو لڑکیاں دکھائیں" —— چھوٹی بہن نے کہا —— "دونوں بہت خوبصورت تھیں اور ذات کی بھی اچھی تھیں لیکن بشیر کہتا تھا کہ میں نے عائشہ کے ساتھ شادی کا وعدہ کیا ہُوا تھا۔ ہم کہتی تھیں کہ عائشہ اس کو نہیں مل سکتی' وہ تو بیاہی گئی ہے لیکن وہ نہیں مانتا تھا"۔

"تم کو شاید معلوم ہو" —— میں نے پوچھا —— "کیا بشیر عائشہ کو اس کی شادی کے بعد بھی ملتا تھا؟"

"میرے گھر میں" —— اس نے جواب دیا —— "یا میری اس بہن کے گھر میں.... باہر کہیں ملتا تھا تو وہ میں نہیں جانتی"۔

ماں بیٹی' دونوں شکاری

یہاں میرے دماغ میں یہ شک پیدا ہو گیا کہ بشیر نے عائشہ کا پیچھا نہیں چھوڑا ہو گا۔ عائشہ کے خاوند نے ان کو کہیں اکٹھے دیکھ لیا ہو گا اور اپنے بھائیوں وغیرہ کو ساتھ ملا کر بشیر کو غائب کر دیا ہو گا۔ غائب کا مطلب قتل ہی ہوتا ہے لیکن بشیر کی بہنیں میرے دماغ کو کسی اور طرف لے جا رہی تھیں۔

"آپا!" —— چھوٹی بہن نے بڑی بہن کو کہا —— "ان کو یہ ضرور بتائیں کہ عائشہ کی ماں کس قماش کی عورت ہے"۔

"عائشہ کہاں کی شریف تھی" —— بڑی بہن نے کہا —— "آپ کسی سے پوچھ لیں۔ وہ عائشہ اور اس کی ماں کی کہانیاں سنائے گا۔ ماں چالاک اور عیّار عورت ہے۔ کسی نہ کسی امیرزادے کو یا کسی بڑے زمیندار کو پھانس لیتی ہے۔ اس کی دو بیٹیاں ہیں۔ ایک عائشہ ہے' دوسری اس سے بڑی ہے۔ اس کو اُس نے لائل پور (آج کل فیصل آباد) کے ایک جاگیردار کے ساتھ نقد رقم لے کر بیاہ دیا تھا۔ اس شخص کی عمر چالیس پچاس کے درمیان ہے۔ وہ ان کی لڑکی کو بیاہ کر لے گیا اور ایک دن کے لئے بھی نہ خود آیا نہ اس بیوی کو لایا۔ وہ ان کی بیٹی کو خرید کر لے گیا ہے' واپس کیوں لائے گا!"۔

"کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ عائشہ بھی ٹھیک کردار کی لڑکی نہیں؟" —— میں نے پوچھا۔

"ہاں جی!" —— اس نے جواب دیا —— "میں یہی کہنا چاہتی ہوں۔ یہ تو ہمارے بھائی کی ضد تھی کہ ہم عائشہ کا رشتہ لینے کے لئے تیار ہو گئی تھیں۔ سچّی بات یہ ہے کہ ہم دونوں بہنوں کو یہ لڑکی پسند نہیں تھی۔ صرف خوبصورتی کو ہم نے کیا کرنا تھا۔ اندر سے کھوکھلی اور تنگ دل ہے۔ میں پہلے اس کی ازدواجی

زندگی کی ایک دو باتیں سنالوں پھر اور کچھ سناؤں گی....

"جس کے ساتھ عائشہ بیاہی گئی وہ کوئی امیر کبیر لوگ نہیں۔ ویسے خوشحال لوگ ہیں۔ ان کو دُور کی رشتہ داری کی مجبوری کی وجہ سے عائشہ کا رشتہ مل گیا تھا' ورنہ ماں نے اس بیٹی کی بھی قیمت وصول کرنی تھی۔ اس لڑکی کی شادی تو ہو گئی لیکن ہفتے میں چار دن ماں کے پاس اور تین چار دن سسرال میں رہتی تھی"۔

اس اتنی لمبی چوڑی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ بشیر کی بہنوں نے عائشہ کی ازدواجی زندگی کی جو باتیں اور وارداتیں سنائی تھیں وہ بہت لمبی کہانی ہے۔ مختصر یہ کہ اس نے اپنے سسرال اور اپنے خاوند کو دل سے قبول نہ کیا اور آباد ہونے کی کوشش نہ کی۔ اس کی ماں پکّی سیاست باز اور شیطان عورت تھی۔ اس نے بیٹی کو سسرال میں آباد ہونے ہی نہ دیا۔ کوئی نہ کوئی مسئلہ کھڑا کر کے رکھتی تھی۔

یہ شخص اور اس کا ایک بھائی کسی سے دبنے والے نہیں تھے لیکن اپنے خاندان کی عزت کی خاطر برداشت کرتے رہے۔ آخر خاوند نے عائشہ کی پٹائی شروع کر دی اور اس کو اپنے گھر میں بند کر کے کہہ دیا کہ آئندہ وہ اپنی ماں کے ہاں نہیں جا سکتی۔ اس پر ماں نے شور شرابہ کیا۔ عائشہ کے سسرال کی طرف سے اعلان ہُوا کہ وہ عائشہ کو گھر سے نکال دیں گے۔ بسائیں گے بھی نہیں اور طلاق بھی نہیں دیں گے مگر اس اعلان کے ایک ہی مہینے بعد عائشہ کا خاوند برساتی نالے میں ڈوب گیا۔

"ایک بات ہے"—— بشیر کی چھوٹی بہن نے کہا—— "لوگ ہمارے بھائی کو لوفر لفنگا اور آوارہ کہتے ہیں۔ آپ اس کی نیت اور اس کا کردار دیکھیں۔ یہ بات سارے شہر میں مشہور ہے کہ عائشہ کا خاوند سیلابی نالے میں گرا تو اس کو بچانے

کی خاطر بشیر نے اوپر سے سیلاب میں چھلانگ لگا دی۔ اُس کو تو خوش ہونا چاہئے تھا کہ عائشہ کا خاوند ڈوب رہا ہے۔ اگر مر گیا تو اچھا ہے' وہ عائشہ کے ساتھ شادی کر لے گا لیکن اُس نے ایسا نہیں سوچا۔ اس کے دل میں انسانی ہمدردی تھی"۔

دونوں بہنوں نے جو بیان دیا وہ آگے اس طرح تھا کہ عائشہ کا خاوند مر گیا تو بشیر نے ایک بار پھر بہنوں کی مِنّتیں شروع کر دیں کہ وہ باپ کو منوائیں اور اس کی شادی عائشہ کے ساتھ کروا دیں۔ انہوں نے باپ کے ساتھ بات کی تو باپ نے ان کو پہلے سے زیادہ ڈانٹ دیا۔ بشیر نے بھی باپ کے ساتھ بات کر کے اس کی ڈانٹ کھائی۔ بشیر نے باپ کے ساتھ تھوڑی سی بدتمیزی بھی کی۔ باپ نے اپنی بیٹیوں کو گھر بلا کر کہا وہ بشیر کو سمجھائیں' اگر یہ باز نہ آیا تو وہ اس کو عاق کر کے گھر سے نکال دے گا۔

پھر لوگوں نے یہ ڈرامہ دیکھا کہ ان کا باپ جناب خواجہ صاحب عائشہ کے گھر جانے لگا اور عائشہ کی ماں نے اس کے گھر آنا شروع کر دیا۔ دونوں بیٹیاں اپنے باپ کے گھر آتی رہتی تھیں۔ انہوں نے باپ کو بتایا کہ عائشہ کی ماں کی ملاقاتوں نے اس کو بدنام کرنا شروع کر دیا ہے۔ باپ نے پرواہ نہ کی۔ وہ عائشہ کی ماں کے جال میں آچکا تھا اور اس عیّار عورت پر دولت لٹا رہا تھا۔

یہ سب عائشہ کی خاطر تھا۔ آخر عائشہ خواجہ صاحب کے ساتھ بیاہی گئی۔
یہ وہی عائشہ تھی جس کو خواجہ اپنے بیٹے کے واسطے اس بنا پر قبول نہیں کرتا تھا کہ اس کے مقابلے میں چھوٹے لوگ ہیں اور اس کی برابری نہیں کر سکتے۔ خواجہ اپنی دنیا کا بادشاہ تھا۔ اس نے کسی کی پرواہ نہ کی نہ اس نے یہ سوچا کہ اس شادی کا آخر انجام کیا ہو گا۔

"بھائی جی!"—— بشیر کی بڑی بہن نے کہا—— "یہ ساری کہانی جو میں نے

آپ کو سنائی وہ اس واسطے سنائی ہے کہ میں اپنے باپ کے خلاف کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ پہلے تو ہم دونوں دن رات یہ دعائیں مانگتی ہیں کہ خدا کرے ہمارا بھائی ویسے ہی کہیں چلا گیا ہو اور صحیح سلامت واپس آجائے۔ اگر آ بھی گیا تو ہمارے بھائی کو ہمارے باپ کی طرف سے خطرہ ہے"۔

"اور یہ خطرہ بھی ہے" — چھوٹی بہن نے کہا — "کہ باپ بیٹا ہاتھ پائی پر نہ اُتر آئیں۔ اگر ایسا ہو گیا تو یہ سوچ لیں کہ بشیر جوان آدمی ہے اور باپ بوڑھا ہے۔ بشیر باپ کو مار ڈالے گا۔ ہم نے دیکھا ہے کہ آج کل اس کا دماغ ٹھیک کام نہیں کرتا۔ آپ یہ تو سمجھتے ہوں گے کہ باپ بیٹے کی دشمنی عائشہ کی وجہ سے ہے"۔

"میں اب ایک بہت ضروری بات سننا چاہتا ہوں" — میں نے پوچھا — "بشیر اور عائشہ گھر میں کس طرح رہتے ہیں؟"

"یہی بات آپ کو بتانی ہے" — بڑی بہن نے کہا — "پہلے بشیر جو وقت باہر گزارتا تھا اب وہ گھر گزارتا ہے۔ عائشہ کو ہمارے باپ کے گھر میں آئے ہوئے چھ مہینے ہو گئے تھے۔ میں نے خود دیکھا اور میری بہن نے بھی دیکھا کہ ہم باپ کے گھر گئیں تو بشیر اور عائشہ کو اکٹھے بیٹھے دیکھا۔ ان کے بیٹھنے کا انداز شریفوں والا نہیں تھا"۔

دماغ میں صرف بدی

میں ان کے بیان کا یہ حصہ بھی اپنے الفاظ میں مختصر کر کے سناؤں گا۔ یہ مجھ کو پہلے ایک معزّز شخص سنا چکا تھا۔ اس کی تصدیق بشیر کی بہنوں نے کی اور مزید باتیں بھی بتائیں۔ بشیر عائشہ پر مرتا تھا۔ وہ اس کی بیوی تو نہ بن سکی، اس کی ماں بن گئی لیکن بشیر کوئی شریف آدمی نہیں تھا کہ اپنی عمر سے ایک سال

چھوٹی لڑکی کو اپنی سوتیلی ماں بنا لیتا۔

اس سے پہلے بشیر کی بڑی یا چھوٹی بہن باپ کے گھر آتی تھی تو بشیر گھر نہیں ہوتا تھا لیکن عائشہ اس گھر میں آئی تو کوئی بہن کسی بھی وقت آجاتی، بشیر گھر میں ہی ہوتا تھا۔ بہنوں نے ان دونوں کا آپس کا رویّہ دیکھا تو انہیں یقین ہو گیا کہ ان کے آپس کے تعلقات شریفوں والے نہیں۔

دونوں بہنوں نے آپس میں صلاح مشورہ کیا کہ عائشہ کو سمجھائیں کہ وہ بشیر کو خراب نہ کرے اور اس کو کہیں شادی کرنے دے لیکن دونوں کے خاوندوں نے ان کو یہ کہہ کر روک دیا کہ عائشہ شیطان ماں کی بیٹی ہے، وہ کوئی فساد کھڑا کر دے گی اور یہ بھی ہو گا کہ ان کا اپنا بھائی ان کے خلاف ہو جائے گا۔

عائشہ کا ان بہنوں کے ساتھ رویّہ بدل گیا۔ وہ اس گھر کی ملکہ بن گئی اور اس نے بشیر کی بہنوں سے بے رخی شروع کر دی۔ اس کے رویّے میں تکبّر اور غرور آگیا تھا۔ اس نے اپنا رویّہ اتنا سخت کر لیا کہ بشیر کی کوئی بہن ان کے گھر جاتی تو عائشہ کسی کام کے بہانے اِدھر اُدھر ہو جاتی اور بہن کے ساتھ بات تک نہ کرتی۔

ایک روز بشیر کا باپ اپنی بڑی بیٹی کے گھر گیا اور اس کو بتایا کہ بشیر عائشہ کو خراب کر رہا ہے اور اس کو ماں کا درجہ نہیں دیتا۔ باپ غصے میں تھا اور وہ دھمکیوں کی زبان میں بات کر رہا تھا۔ وہاں سے وہ چھوٹی بیٹی کے گھر گیا اور اس کے ساتھ بھی ایسی ہی باتیں کیں۔ بہنوں نے آپس میں بات کر کے بشیر کو بلایا اور اس کو بتایا کہ ابو کیا کہہ گئے ہیں پھر اس کو سمجھانے بجھانے کے واسطے کچھ باتیں کیں۔ بشیر نے کچھ سمجھنے یا باپ سے ڈرنے کی بجائے باپ سے زیادہ دھمکیاں دیں اور بہنوں کو یقین دلایا کہ عائشہ کو وہ اپنی ماں تو نہیں بنا سکتا لیکن اس کے ساتھ اس کے تعلقات ایسے ہی ہیں جیسے کسی کے اپنی ماں کے ساتھ

ہوتے ہیں۔

بہنوں کو یہ خطرہ صاف نظر آنے لگا کہ باپ بیٹے کے درمیان دشمنی پیدا ہو گئی ہے اور اس کا انجام بہت بُرا ہو گا۔ بشیر کہتا تھا کہ باپ نے اپنا رویّہ نہ بدلا تو وہ اس گھر سے نکل جائے گا۔ اس نے خطرناک بات یہ کہی کہ کہ وہ اس گھر سے نکل گیا تو عائشہ بھی اس گھر میں نہیں رہے گی۔

دونوں بہنیں عائشہ کے ہاں گئیں اور اس کو بتایا کہ اس کی وجہ سے باپ بیٹے کے درمیان دشمنی پیدا ہو گئی ہے اور وہ بشیر کو اپنے پاس نہ بیٹھنے دیا کرے۔

"تم اپنے بھائی کو کیوں نہیں سمجھاتیں؟" —— عائشہ نے بڑے رعب سے کہا۔

"وہ تو بیوقوف ہے" —— بڑی بہن نے کہا —— "اس کو ہم سمجھا چکی ہیں لیکن وہ نہیں سمجھتا"۔

"تم اصل بات جانتی ہو عائشہ!" —— چھوٹی بہن نے کہا —— "بشیر تمہارے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا لیکن ہمارے ابو نے تمہیں اپنی بیوی بنا لیا۔ یہ ایسا صدمہ ہے جس کو ہمارا بھائی برداشت نہیں کر رہا۔ ہم تمہاری ازدواجی زندگی میں دخل دینا ٹھیک نہیں سمجھتیں۔ ہم تمہیں یہ بتانے آئی ہیں کہ باپ بیٹے کی آپس کی دشمنی نے کوئی اور رنگ دکھا دیا تو وہ تمہارے واسطے اچھا نہیں ہو گا"۔

"میری ازدواجی زندگی کا تم غم نہ کرو" —— عائشہ نے کچھ تکبّر کے لہجے میں کہا —— "میں اپنا نفع نقصان خود سوچ سکتی ہوں۔ تمہیں میں صرف یہ بتا دیتی ہوں کہ بشیر کے ساتھ میرا وہ تعلق نہیں جو تم سمجھتی ہو۔ میرے اوپر کوئی فضول الزام نہ دھرنا"۔

ان دونوں بہنوں نے مجھ کو عائشہ کی جو باتیں اور جو رویّہ سنایا' اس سے

صرف یہ ظاہر ہوتا تھا کہ خاوند کی دولت اور جائیداد نے اس کا دماغ خراب کر کے بہت اونچا کر دیا تھا۔ اس نے بشیر کی بہنوں کو اس طرح ٹالا جس طرح کوئی ملکہ اپنے دربار میں سے کسی کو نکالتی ہے۔ میرا ذاتی خیال یہ تھا کہ عائشہ نے شادی تو بشیر کے باپ کے ساتھ کی تھی لیکن اس نے اپنا خاوند بشیر کو بنایا ہُوا تھا۔ بشیر کے باپ یعنی خواجہ صاحب کے ساتھ اس کی اور اس کی ماں کی دلچسپی روپے پیسے کے ساتھ تھی۔

ان دونوں بہنوں کے بیانات سے اور بشیر اور عائشہ کے رویّے سے میرا دماغ اس نتیجے پر پہنچا کہ باپ بیٹے کی دشمنی اتنی بڑھ گئی تھی کہ باپ نے بیٹے کو جائیداد سے عاق کرنے کی دھمکی دی ہو گی اور ان میں لڑائی جھگڑا بھی ہُوا ہو گا اور اس کے نتیجے میں بشیر گھر سے چلا گیا۔ اگر ایسا ہی ہُوا تھا تو میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے پہلے کہا ہے کہ بشیر کی عمر چھبیس سال تھی۔ اس عمر میں انسان اپنے ہر قول اور فعل کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

میرے دماغ میں یہ شک بھی آیا تھا کہ باپ نے بیٹے کو قتل ہی نہ کرا دیا ہو۔ خواجہ کے کردار جیسے لوگ عموماً" جذبات سے عاری ہو جاتے ہیں۔ وہ دولت مند بھی تھا' شرابی کبابی بھی تھا اور اس کا دوستانہ غیر مسلموں کے ساتھ زیادہ تھا۔ انگریزوں کا وہ ایسا غلام تھا کہ ان کو آسمان سے اُترے ہوئے فرشتے سمجھتا تھا۔ اس کا جو کردار تھا' وہ اسی ایک بات سے ظاہر ہوتا تھا کہ جس نوجوان لڑکی کے ساتھ بیٹا شادی کرنا چاہتا تھا اس لڑکی کے ساتھ اس نے خود شادی کر لی۔ یہ سب کچھ سوچنے کے باوجود مجھ کو خیال آیا کہ باپ اپنے اکلوتے بیٹے کو قتل نہیں کروا سکتا۔

میں آپ کو سچّی بات بتاؤں' میں نے اس کیس کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی تھی۔ یہ کوئی گھریلو چکر تھا' اسی بنا پر میں تفتیش کر رہا تھا کہ خواجہ کے گھر کی

باتیں معلوم ہو جائیں جو میں خواجہ کے آگے رکھ دوں کہ اپنے بیٹے کے واسطے تم نے یہ حالات پیدا کر دیئے تھے اور اس کے نتیجے میں تمہارا بیٹا گھر سے بھاگ گیا ہے۔

اگر خواجہ یہ رپورٹ لکھواتا کہ اس کا بیٹا گھر سے زیورات اور کچھ رقم چوری کر کے لے گیا ہے تو میں اس کو چوری کی واردات لکھ کر ملزم کو پکڑنے کی کوشش کرتا۔

بشیر کی بہنوں نے میرے سامنے ایسی تصویر رکھ دی تھی جس میں بہت باریک سی چیزیں بھی صاف نظر آتی تھیں۔ ان دونوں کے خاوند باہر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے لڑکیوں کو الگ کمرے میں بٹھا دیا اور ان کے خاوندوں کو بلا لیا۔ تفتیش ایک ایک فرد سے الگ الگ کی جاتی ہے پھر ان کے بیانات ملائے جاتے ہیں۔ ان میں اگر اختلاف پائے جائیں تو تفتیشی افسر کا کام آسان ہو جاتا ہے۔ مجھ کو یاد نہیں کہ میں نے کس خیال سے دونوں خاوندوں کو ایک ہی بار بلا لیا تھا۔

میں نے ان کو بتایا کہ دو آدمیوں کو اکٹھے بٹھا کر تفتیش نہیں ہُوا کرتی' اگر ان کی ہم خیالی نہیں تو بتا دیں۔ دونوں نے کہا کہ جہاں تک خواجہ' اس کے بیٹے اور عائشہ کا تعلق ہے' ان کی آپس میں ہم خیالی ہے اور بہتر یہی ہے کہ دونوں کو اکٹھے بٹھا کر ہی تفتیش کی جائے۔ میں نے ان کو کہا کہ وہ بشیر کی گمشدگی کے بارے میں اپنی اپنی رائے دیں۔ ان کو یہ بھی کہا کہ عائشہ اور خواجہ کے بارے میں وہ جو کچھ بھی کہنا چاہتے ہیں یا کہنا چاہئے وہ کہیں اور یہ مت سوچیں کہ کتنا وقت لگے گا' بے شک پوری رات بولتے رہیں' کوئی بات چھوڑیں نہیں۔

دونوں نے جو بیان دیا وہ سوفیصد بشیر کی بہنوں کے بیان سے ملتا تھا۔ پہلے تو میرا خیال تھا کہ بہنیں آخر بہنیں ہیں اور ان کا باپ بھی اس واردات میں ملوّث

ہے اور یہ بات بھی ہے کہ دونوں عورتیں ہیں' اس واسطے وہ کوئی چھوٹی سی بات بڑھا چڑھا کر بیان کریں گی اور کسی بڑی بات کو بالکل ہی معمولی سمجھ کر مختصر سا بیان کریں گی اور بعض ضروری باتوں پر پردہ ڈال دیں گی لیکن ان کے خاوندوں نے بیانات دیئے تو مجھ کو پتہ لگا کہ دونوں بہنوں نے ہر وہ بات بیان کر دی ہے جس کی مجھ کو ضرورت تھی۔

ساری بات سنا کر دونوں نے متفقّہ طور پر یہ رائے دی کہ خواجہ دولت اور جائیداد کے نشے میں بدکردار ہو گیا ہے اور بڑی اوچھی حرکتیں کرتا ہے۔ اس کے اندر کوئی انسانی جذبات نہیں۔ بیٹیوں کو بیاہ کر ان سے لاتعلق ہو گیا ہے اور سوائے بدی کے اس کے دماغ میں کوئی خیال نہیں آتا۔

"آپ خود سمجھ سکتے ہیں صاحب!"—— بڑی بہن کے خاوند نے کہا—— "اتنی نوجوان اور خوبصورت لڑکی ایک نوجوان لڑکے کے ساتھ رہتی ہو اور اس کا خاوند اس کے نانے دادے کی عمر کا ہو تو ہو ہی نہیں سکتا کہ لڑکی اور لڑکے کے تعلقات ماں بیٹے والے ہوں اور یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ باپ کو یعنی لڑکی کے خاوند کو پتہ ہی نہ ہو۔ یہ تو ہم دونوں آپ کو پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ بشیر اپنے باپ سے زیادہ لوفر اور بدکردار ہے۔ اس کو لوگ جو آوارہ شہزادہ کہتے ہیں وہ غلط نہیں کہتے"۔

"میری ایک بات پر غور کریں"—— میں نے کہا—— "اگر میں کہوں کہ باپ نے بشیر کو موقعہ پر پکڑ لیا تھا اور اس کو قتل کروا دیا ہے تو آپ لوگ کیا کہیں گے"۔

میرے اس سوال کا جواب بھی دونوں نے متفقّہ طور پر یہ دیا کہ خواجہ کا کوئی بھروسہ نہیں اور کوئی بعید نہیں کہ اس نے یہ کام بھی کر دکھایا ہو۔ بڑی بہن کا خاوند ذرا زیادہ تعلیم والا تھا اور اس میں عقل اور دانش بھی تھی۔ اس

نے بڑی اچھی بات کہی۔

"بوڑھے کی نفسیات پر بھی غور کریں صاحب!"—— اس نے کہا—— "بوڑھے آدمی کو اُس وقت بڑھاپے کا احساس زیادہ ہوتا ہے جب اس کے مقابلے میں کوئی جوان آدمی موجود ہو۔ خواجہ صاحب جب دیکھتے ہوں گے کہ ان کی بیوی ان کے بیٹے کی طرف مائل ہے تو ان پر بڑھاپے کا احساس اتنا زیادہ سوار ہو جاتا ہو گا کہ وہ غصے سے پاگل ہو جاتے ہوں گے۔ یہ پاگل پن قتل تک بھی پہنچا سکتا ہے اور خودکشی بھی کرا سکتا ہے۔ عورت کے سامنے کوئی مرد اپنے آپ کو جسمانی طور پر کمزور نہیں کہلانا چاہتا۔ اس صورتِ حال میں یہ شک غلط نہیں ہو سکتا کہ خواجہ صاحب نے بیٹے کو قتل یا کسی اور طریقے سے غائب کروا دیا ہے"۔

ان دو اشخاص اور ان کی بیویوں نے مجھ کو بڑی کار آمد باتیں بتا دیں اور میں نے ان کو جانے کی اجازت دے دی۔

خواجہ کے غنڈے

سورج غروب ہو رہا تھا جب میں گھر جانے کے واسطے تھانے سے اُٹھا۔ میں باہر نکل رہا تھا کہ خواجہ آ گیا اور کہنے لگا کہ وہ بڑی ضروری بات کرنے آیا ہے۔ میں اس امید پر بیٹھ گیا اور اس کو بھی بٹھا لیا کہ اپنے بیٹے کا کوئی سراغ لایا ہو گا لیکن اس نے بات کر کے مجھ کو مایوس کر دیا۔

"انسپکٹر صاحب!"—— اس نے کہا—— "آج آپ نے میری بیٹیوں اور میرے دامادوں کو بلایا تھا"۔

"ہاں خواجہ صاحب!"—— میں نے کہا—— "میں نے انہیں بلایا تھا"۔

"وہ کیا کہہ گئے ہیں؟"

"خواجہ صاحب!"—— میں نے کہا—— "یہ تفتیش میں کر رہا ہوں، آپ نہیں۔ آئندہ مجھ سے ایسی کوئی بات نہ پوچھنا کہ کس نے کیا کہا.... اور کوئی ضروری بات آپ نے کرنی ہے؟"

"بات تو ضروری ہے جناب!"—— اُس نے افسروں کے سے لہجے میں کہا—— "ان کی ہر بات کو سچ نہ مان لینا۔ کچھ لوگ مجھ کو ویسے ہی بدنام کرتے رہتے ہیں۔ میرا جوان بیٹا لاپتہ ہو گیا ہے۔ آپ اس کا سراغ لگائیں"۔

"کیا آپ نے خود کوئی سراغ نہیں لگایا؟"

"میں ہر کسی سے پوچھتا پھر رہا ہوں"—— اُس نے کہا—— "لیکن جو کام آپ کر سکتے ہیں وہ میں تو نہیں کر سکتا"۔

"خواجہ صاحب!"—— میں جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا اور اس کو کہا—— "میرا جو کام ہے وہ میں خود کر سکتا ہوں اور کر رہا ہوں۔ آپ نے بیٹے کے واسطے جو حالات پیدا کئے ہیں، ان میں کوئی بیٹا گھر میں نہیں رہ سکتا.... بہرحال ابھی تفتیش شروع کی ہے۔ میں بتا نہیں سکتا کہ میں اور کیا کروں گا اور کس کس کو تھانے بلاؤں گا۔ آپ تھانے میں اُس وقت آئیں جب میں بلاؤں یا اُس وقت جب آپ نے کوئی بہت ہی ضروری بات کرنی ہو۔ کوئی فضول بات سننے کے واسطے میرے پاس ٹائم نہیں.... آپ تشریف لے جائیں"۔

میں تھانے سے نکل گیا۔

آج کل پولیس کا معاملہ کچھ اور ہے، انگریزوں کے وقتوں میں تھانیدار کی زندگی بڑی مشکل زندگی ہُوا کرتی تھی۔ رات کو خواب میں بھی تھانیدار کا دماغ تفتیش میں ہی مصروف رہتا تھا۔ گھر جا کر وردی اتاری، غسل وغیرہ کر کے کھانا کھایا تو ایک مخبر آ گیا۔ میں نے اپنے مخبروں کو کہا ہُوا تھا کہ وہ کوئی ضروری

رپورٹ ہو تو یہ نہ دیکھا کریں کہ دن ہے یا رات' میرے گھر آجایا کریں خواہ آدھی رات ہی کیوں نہ ہو۔

یہ میرا خاص مخبر تھا۔ بڑے کام کی خبریں لایا کرتا تھا لیکن اس کیس میں وہ میرے واسطے کوئی نئی بات نہ لایا۔ اس نے وہی باتیں سنائیں جو خواجہ کی بیٹیاں اور اس کے داماد سنا گئے تھے۔ ایک بات مجھ کو پہلے ہی معلوم تھی۔ وہ یہ تھی کہ خواجہ نے غنڈے اور بدمعاش ہاتھ میں رکھے ہوئے تھے۔ اس مخبر نے ایسے تین غنڈوں کے نام بتائے جن کے ساتھ خواجہ کی بڑی گہری دوستی تھی۔ ان میں دو دس نمبرئے بدمعاش تھے اور ایک سزا یافتہ عادی مجرم تھا۔ اس مخبر نے بتایا کہ یہ جو عادی مجرم ہے' ایک دو دنوں سے خواجہ کے ساتھ ساتھ رہتا ہے۔

"آپ بشیر کے دوستوں کے ضرور بلائیں — اس نے کہا — "بشیر ہر بات اپنے دوستوں کے ساتھ کرتا تھا۔ میں نے بہت کوشش کی ہے کہ ان سے کوئی بھید لوں لیکن مجھ کو وہ کچھ نہیں بتاتے۔ میں آپ کو یہ بتا سکتا ہوں کہ خواجہ کی یہ نوجوان بیوی اور اس کی ماں خواجہ کو خوب لُوٹ رہی ہیں"۔

میں نے اس مخبر کو کچھ نئی ہدایات دیں اور اس کو رخصت کر دیا۔

میں نے اگلے روز تھانے میں جاتے ہی خواجہ کے ان تینوں غنڈوں کو بلوایا اور گزشتہ رات مخبر نے بشیر کے جس دو دوستوں کے نام بتائے تھے' ان کو بھی بلوایا۔

سب سے پہلے خواجہ کا وہ آدمی آیا جو عادی مجرم بھی تھا۔ میں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ تھانے میں اور بہت سے کام تھے۔ کچھ وارداتوں کی تفتیش ہو رہی تھیں' میں ان میں مصروف ہو گیا۔ جرائم پیشہ لوگوں کا تھانے میں آکر بیٹھ جانا ایک روٹین تھی۔ تھانے کو وہ اپنا گھر سمجھتے تھے۔

تقریباً" ڈیڑھ گھنٹے بعد بشیر کے دونوں دوست آگئے۔ ان کو میں انتظار میں

بٹھانا مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ ان میں سے ایک کو بلا لیا۔ اس سے میں نے جو سوال پوچھے وہ یہ تھے:

"کیا بشیر کا کوئی دوست باہر کہیں رہتا ہے جہاں وہ چلا گیا ہو؟"

"اپنے باپ کے بارے میں وہ کوئی راز کی بات بتاتا تھا؟"

"کیا بشیر کی کسی عورت کے معاملے مین یا کسی اور وجہ سے کسی کے ساتھ دشمنی تھی؟"

"کیا بشیر نے کبھی یہ کہا تھا کہ وہ اپنے باپ سے اتنا تنگ ہے کہ گھر سے بھاگ جائے گا؟"

"یا کوئی اور راز کی بات؟"

اس نوجوان نے مجھ سے چھپایا تو کچھ نہیں لیکن راز کی کوئی بات نہ بتا سکا۔ باہر کہیں بشیر کا کوئی دوست نہیں تھا۔ اس نے گھر سے چلے جانے کی کبھی بات نہیں کی تھی۔ سوائے عائشہ کے اس کے تعلقات کسی اور کے ساتھ نہیں تھے اور عائشہ کے ساتھ اس کے تعلقات پاک صاف نہیں تھے۔ اس کو وہ محبت کرتا تھا۔ عائشہ کی پہلی شادی ہوئی تو بھی وہ بشیر سے ملتی رہی۔

میں نے بشیر کے اس دوست سے پوچھا کہ بشیر نے کبھی خودکُشی کی بات کی تھی یا نہیں۔ دوست نے کہا کہ وہ خودکُشی کرنے والا آدمی نہیں تھا۔ وہ تو دوسروں کو مارنے پر تیار رہتا تھا۔

اس کے دوسرے دوست کو بلایا تو وہ بھی کوئی خاص بات نہ بتا سکا۔ اس نے جو کچھ بتایا وہ اس کے دوست کی تصدیق اور تائید کرتا تھا۔

اس دوران خواجہ کے تینوں غنڈے دوست آچکے تھے۔ میں نے تینوں کو اکٹھے ہی بلا لیا۔ ان لوگوں سے ہم کسی اور طریقے سے پوچھ گچھ کیا کرتے تھے لیکن میں نے مناسب یہ سمجھا کہ ان کو پہلے تھوڑی وارننگ دے دوں۔ بے

شک یہ خواجہ کے آدمی تھے لیکن دراصل یہ پولیس کے آدمی تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ سزا پولیس دے سکتی ہے۔ خواجہ انہیں صرف انعام دیا کرتا تھا۔ میں نے ان کو بلا کر کہا کہ وہ خواجہ کے آدمی ہیں اور خواجہ کا بیٹا لاپتہ ہو گیا ہے اور وہ تینوں اس لڑکے کا سراغ لگائیں اور اگر معاملہ کچھ اور ہے تو مجھ کو صاف بتا دیں ورنہ وہ جانتے ہیں کہ میں ان کی ساتھ کیا سلوک کروں گا۔

تینوں نے قسمیں کھانی شروع کر دیں اور ہاتھ جوڑ جوڑ کر مجھ کو یقین دلانے لگے کہ کوئی گڑ بڑ نہیں۔ انہوں نے بتایا کہ خواجہ نے پہلے ہی انہیں بڑی سختی سے کہا ہے کہ اس کے بیٹے کا کھوج لگائیں۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ خواجہ بہت پریشان ہے۔

"تم بکواس کرتے ہو" — میں نے کہا — "خواجہ بالکل پریشان نہیں۔ تم جانتے ہو کہ خواجہ کی بیوی نوجوان ہے اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ وہ کس ماں کی بیٹی ہے۔ خواجہ کبھی پسند نہیں کرتا کہ اس کا جوان بیٹا اس کی غیر حاضری میں اس کی بیوی کے ساتھ رہے۔"

"ہم سب جانتے ہیں سرکار!" — عادی مجرم نے دوسروں کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا — "خواجہ کے گھر میں جو ڈرامہ چل رہا ہے وہ ہم سارے کا سارا جانتے ہیں۔ ہماری جتنی دوستی خواجہ صاحب کے ساتھ ہے اس سے زیادہ محبت بشیر کے ساتھ ہے۔ ہم اُن کا کھوج لگا رہے ہیں۔"

میں نے ان کو اور زیادہ ڈرایا دھمکایا اور کہا کہ وہ اس معاملے میں مخبری کریں اور دو تین دنوں میں لڑکا برآمد کریں۔

چھوٹی بہن بیہوش ہو گئی

اس کیس کی تفتیش ہوتی رہی۔ مجھ کو کچھ بھی ہاتھ نہ آیا۔ تین چار دن مزید گزر گئے۔ اگر مجھ کو آج ٹھیک یاد ہے تو ایک ہفتہ گزر گیا تھا۔

دن کے دو اور تین بجے کے درمیان کا وقت تھا۔ ایک دیہاتی آدمی تھانے میں آیا۔ اُس نے چادر میں کچھ لپیٹا ہُوا تھا۔ میں اتفاق سے برآمدے سے کھڑا کسی کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ اس دیہاتی نے پوچھا کہ تھانیدار صاحب کون ہیں۔ میں نے اس کو اپنے پاس بلایا۔ اس نے رکوع کی پوزیشن تک جھک کر مجھ کو مغلیہ بادشاہوں والا سلام کیا اور چادر فرش پر رکھ کر کھولی۔

اگر کوئی عام شہری دیکھتا تو بدک کر پیچھے ہٹ جاتا لیکن پولیس والوں کو پتھر دل ہونا پڑتا ہے۔ چادر پر کسی انسان کا ایک بازو پڑا ہُوا تھا۔ یہ کہنی تک تھا یعنی ہاتھ سے کہنی تک تھا۔ ہاتھ سلامت تھا۔ کلائی سے اوپر تک تقریباً آدھا گوشت کھایا ہُوا تھا۔ بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی میں چاندی کا سیدھا سادا رِنگ تھا اور اس کی ساتھ والی انگلی میں سونے کی انگوٹھی تھی۔ انگوٹھی کے اوپر والا حصہ چوڑا اور چوکور تھا۔ میں نے بیٹھ کر اس انگوٹھی کو غور سے دیکھا۔ مجھ کو کچھ شک سا ہُوا۔ میں نے انگوٹھی کا اوپر والا چوکور حصہ چادر سے صاف کیا تو صاف طور پر پڑھا گیا — "بشیر" — یہ لفظ کُھدا ہُوا نہیں بلکہ اُبھرا ہُوا تھا اور یہ بڑی خوبصورت انگوٹھی تھی۔ اُس زمانے میں عموماً نوجوان لڑکے جو سونے کی انگوٹھی بنوانے کی ہمت رکھتے تھے وہ انگوٹھی پر اپنا نام بھی لکھوایا کرتے تھے۔

اس دیہاتی کا بیان لینے سے پہلے میں نے ایک کانسٹیبل کو یہ کہہ کر دوڑایا کہ وہ بشیر کے باپ خواجہ کو ساتھ لے آئے۔ اس دیہاتی سے پوچھا کہ بازو اُس کو کہاں سے ملا ہے۔ اس کا بیان سنانے سے پہلے میں اُس وقت اور آج کا فرق

بتانا چاہتا ہوں۔ آج کل لوگوں کے سامنے قتل کی واردات ہوتی ہے یا کسی لڑکی کو اٹھا کر گاڑی میں پھینکتے اور لے جاتے ہیں لیکن کوئی ایک بھی عینی شاہد سامنے نہیں آتا۔ جو لوگ ملزموں کو اچھی طرح پہچانتے ہیں وہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ انہوں نے دیکھا ہی نہیں۔ رات کو سڑک پر کوئی زخمی پڑا ہُوا ہو تو کوئی اس کے قریب نہیں جاتا کہ پولیس پکڑ لے گی۔ میں جس وقت کی واردات سنا رہا ہوں اس وقت کسی بھی شخص کو کوئی بھی مشکوک چیز نظر آتی تھی یا کسی زیرِ تفتیش واردات کا کوئی سراغ ملتا تھا تو فوراً" تھانے اطلاع دیتا تھا۔ اُس وقت پبلک کو یقین تھا کہ پولیس دیانتداری سے تفتیش کرتی ہے اس واسطے پبلک پولیس کی مدد کرتی تھی۔

یہ دیہاتی خالص دیہاتی تھا اور بالکل اَن پڑھ۔ اس کو یہ خیال آیا ہو گا کہ پولیس اس شخص کے قتل کی تفتیش کر رہی ہو گی۔ اس نے اپنا فرض سمجھا کہ یہ بازو پولیس کے پاس پہنچنا چاہئے۔ اس نے قصبے سے تقریباً" ایک میل دُور ایک جگہ بتائی جہاں سے اس کو بازو ملا تھا۔ وہ ایک ویرانہ تھا جہاں گہرے اور چوڑے کھڈ تھے اور زمین کٹی پھٹی تھی۔ اُس نے بتایا کہ وہاں کھائی ہوئی ایک لاش ہے جس کو گیدڑ وغیرہ نکال رہے تھے۔ اس دیہاتی کے ساتھ دو آدمی اور تھے۔ یہ تینوں قصبے کی طرف پیدل آ رہے تھے۔ وہ کوئی باقاعدہ راستہ نہیں تھا۔ راستہ چھوٹا کرنے کی غرض سے وہ کھڈ کے اوپر اوپر سے گزر رہے تھے تو ان کو لاش کا کچھ حصہ نظر آیا باقی زمین میں دبا ہُوا تھا۔

ایک گیدڑ یہ بازو منہ میں اٹھائے جا رہا تھا اور دو گیدڑ اس سے بازو چھین رہے تھے۔ ان دیہاتیوں نے اوپر سے گیدڑوں کو پتھر مارے تو وہ بازو وہیں پھینک کر بھاگ گئے۔ دیہاتی نیچے آئے۔ انہوں نے اس شخص کو بازو چادر میں لپیٹ کر دیا اور کہا کہ یہ تھانے لے جائے اور وہ دونوں اس واسطے وہاں بیٹھ

گئے کہ لاش کی رکھوالی کریں گے۔

مجھ کو خواجہ کا انتظار تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ وہ انگوٹھی کو شناخت کر لے تو اس کو ساتھ لے جائیں۔

کچھ دیر بعد خواجہ آ گیا۔ وہ اکیلا نہیں تھا۔ کانسٹیبل نے اس کو بتایا کہ ایک بازو برآمد ہُوا ہے۔ چل کر دیکھیں کہ یہ اس کے بیٹے کا ہی نہ ہو۔ اس نے اپنی بیٹیوں اور دامادوں کو اطلاع کر دی اور وہ سب اس کے ساتھ آئے تھے۔ انہوں نے ایک انگلی میں رِنگ اور دوسری میں انگوٹھی دیکھی تو بہنوں کی چیخیں نکل گئیں۔ خواجہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔۔۔ بلا شک و شبہ یہ بازو بشیر کا تھا۔

میں ان سب کو اور اپنے عملے کے تین چار آدمیوں کو ساتھ لے کر اس دیہاتی کی رہنمائی میں لاش والی جگہ پہنچا۔ پہلے بیان کیا ہے کہ یہ ایک ویرانہ تھا۔ اُس وقت آبادی بہت کم تھی۔ کئی جگہیں ایسی تھیں جہاں سے کوئی گزرتا بھی نہیں تھا۔ یہ وسیع کھڈ تھا۔ اس کے دو طرف کنارے مٹی کی دیواروں جیسے اونچے اور ٹوٹے پھوٹے تھے اور دو طرف گھاٹیاں تھیں۔ کناروں کے ساتھ زمین کٹی پھٹی تھی اور اس میں کہیں تنگ اور ذرا کشادہ دراڑیں تھیں۔ زمین کہیں اونچی کہیں نیچی تھی۔ درخت بہت تھے۔

میں نے درختوں اور اونچے کناروں پر گِدھ بیٹھے ہوئے دیکھے۔ ان کو پتہ لگ گیا تھا کہ یہاں لاش پڑی ہوئی ہے۔ لاش کے پاس دو دیہاتی کھڑے تھے۔ اس دیہاتی نے جو بازو لے کر تھانے گیا تھا' مجھ کو وہ جگہ بتائی جہاں بازو پڑا ہُوا تھا۔ وہ جگہ لاش سے تیس پینتیس قدم دور تھی۔

لاش کو جا کر دیکھا۔ اس کو ایک دراڑ میں دبایا گیا تھا۔ گہرائی تقریباً" دو فٹ تھی۔ نیچے کا دھڑ ننگا تھا اور ٹانگوں سے بہت سا گوشت کھایا ہُوا تھا۔ ایک پہلو سے بھی لاش ننگی ہو گئی تھی۔ اِدھر سے گیدڑ نے بازو اتارا تھا۔ باقی لاش ابھی

مٹی میں دبی ہوئی تھی۔ سینہ اور چہرہ سامنے نہیں تھے۔

میں نے لاش سے مٹی ہٹوائی۔ اس دراڑ کے دائیں بائیں کی زمین بتا رہی تھی کہ یہاں سے مٹی لاش کے اوپر ڈالی گئی تھی۔ لاش ننگی ہو گئی تو میرے کہنے پر لاش کے چہرے کو ایک آدمی نے ہاتھوں سے اتنا صاف کر دیا کہ آسانی سے پہچانا جا سکتا تھا۔ خواجہ' اس کی بیٹیوں اور دامادوں نے آگے ہو کر دیکھا اور تصدیق کر دی کہ یہ بشیر کی لاش ہے۔

ان کی جو حالت ہوئی وہ آپ کو کن الفاظ میں بتاؤں۔ چھوٹی بہن صدمے سے بیہوش ہو گئی۔ بڑی بہن بیہوش تو نہ ہوئی لیکن ہوش میں بھی نہیں لگتی تھی۔ اپنے بال نوچتی اور کپڑے پھاڑتی تھی۔ اس کا خاوند اور باپ اس کو قابو میں کرتے تھے لیکن وہ ہاتھ نہیں آتی تھی۔ اپنے پیارے اور خوبرو بھائی کی لاش کی یہ حالت دیکھ کر کوئی بہن ہوش و حواس میں نہیں رہ سکتی۔

خواجہ اپنی بیٹیوں کو سنبھال رہا تھا۔ اس کے آنسو بہہ رہے تھے اور وہ خاموش تھا۔

"ایک بیٹے کے بدلے تمہارے دس بیٹے قتل کروں گا دشمنو!"—— اچانک خواجہ نے بڑی بلند آواز میں کہا—— "تم جو کوئی بھی ہو' تمہیں میں پکڑوں گا۔ اپنے ہاتھوں سے بدلہ لوں گا"۔

پھر خواجہ واہی تباہی بکنے لگ۔ کچھ دیر بعد ایسے پتہ لگتا تھا جیسے خواجہ کا دماغی توازن بگڑ گیا ہو۔ خبر شہر میں پہنچ گئی تھی۔ لوگ اکٹھے ہوتے جا رہے تھے۔

وہاں قریب چھوٹا سا ایک گاؤں تھا۔ وہاں کا نمبردار آگیا تھا۔ قصبے کا نمبردار بھی موجود تھا۔ میں نے دونوں کو کہا کہ چارپائی کا بندوبست کریں۔ نمبرداروں کو ان حالات میں اپنی ڈیوٹی کا پتہ ہوتا تھا۔ قصبے کے نمبردار نے کہا کہ چارپائی آ رہی ہے۔

میں نے زمین پر بیٹھ کر لاش کی برآمدگی اور حالت کی تحریر لکھی اور لاش کو سب سے پہلے دیکھنے والوں کو تحریر سنا کر ان کے انگوٹھے لگوائے' خواجہ کے دستخط کروائے اور لاش کو چارپائی پر ڈلوا کر ہیڈ کانسٹیبل کے ہمراہ برائے پوسٹمارٹم قصبے کے سول ہسپتال بھیج دیا۔

وہاں کھرے دیکھنے اور تلاش کرنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ معلوم نہیں مقتول کتنے دن پہلے مارا گیا تھا۔ میں نے لاش کی جامہ تلاشی کی تھی۔ اس کی قمیض کی جیب میں دس بارہ روپے تھے۔ لاش کا جو بازو تھانے میں میرے پاس آیا تھا' اس کی ایک انگلی میں سونے کی انگوٹھی تھی۔ اس سے یہ ظاہر ہُوا کہ یہ انتقامی قتل ہے اور قاتل کو پیسوں اور سونے کی انگوٹھی کے ساتھ دلچسپی نہیں تھی۔

میں نے لاش کو غور سے دیکھا تاکہ کہیں ضرب یا زخم مل جائے لیکن نہ ملا۔ سر سے کچھ خون نکلا لگتا تھا۔ میں نے بال ہٹا کر دیکھا تھا۔ مجھ کو سمجھ نہیں آئی کہ یہ کیسے زخم تھے اور خون کس طرح نکلا تھا۔

ماں نے بیٹی کی قیمت وصول کی

وہاں سے میں خواجہ کے محلے میں چلا گیا۔ ابتدائی تفتیش وہاں جا کر کرنی تھی۔ خواجہ مجھ کو اپنے گھر لے جا رہا تھا لیکن میں نے وہاں اس واسطے بیٹھنا اچھا نہ سمجھا کہ رات کو لاش نے آجانا تھا اور اس گھر میں بڑا زبردست ماتم ہونا تھا۔ مجھ کو سکون اور خاموشی والا ماحول درکار تھا۔ نمبردار مجھ کو اپنی بیٹھک میں لے گیا۔ میں نے سب سے پہلے مقتول کے باپ خواجہ کو بلایا۔

"خواجہ صاحب!"—— میں نے اس کو کہا—— "آپ کا اس صدمے سے جو حال ہو رہا ہے اس کو میں سمجھتا ہوں لیکن اب ضرورت یہ ہے کہ آپ ہوش

میں آئیں اور جذباتی باتوں سے ہٹ کر حقیقت کی باتیں کریں۔ ہم نے قاتل کو پکڑنا ہے۔ میں اپنی تفتیش کروں گا۔ آپ اپنی سراغرسانی کریں۔ غور کریں کہ آپ کا دشمن کون ہے اور یہ بھی سراغرسانی کریں کہ آپ کے بیٹے کا دشمن کون تھا۔ مجھ کو شک ہے کہ کسی کی بیٹی کے ساتھ آپ کے بیٹے کے تعلقات تھے یا کسی کی بہو بیٹی پر اس نے دست درازی کی ہو گی اور غیرت والوں نے اپنی بے عزتی کا انتقام لے لیا.... میں آپ سے ابھی اور کچھ نہیں پوچھوں گا"۔

"میری تو کمر ٹوٹ گئی ہے محبوب عالم صاحب!"— اُس نے زارو قطار روتے ہوئے کہا— "میں قاتل کا سراغ لگا لوں گا"۔

"سراغ لگانا میرا کام ہے"— میں نے کہا— "آپ میری مدد کریں.... اب آپ جائیں اور اپنی بیگم کو میرے پاس بھیج دیں"۔

وہ کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ میں اس کی ہر حرکت نوٹ کر رہا تھا۔ وہ بے شک روتا تھا اور غمزدہ لگتا تھا لیکن میری نگاہ میں مُشتبہ تھا۔ اپنی بیوی کو وہ میرے پاس بھیجنے سے گھبرا رہا تھا۔ میں نے اس کو ایک بار پھر کہا کہ وہ چلا جائے اور بیوی کو میرے پاس بھیج دے۔

"وہ بیوقوف سی لڑکی ہے"— اس نے آہستہ آہستہ کہا— "ویسے ہی اِدھر اُدھر کی ٹکا دیا کرتی ہے"۔

"خواجہ صاحب!"— میں نے کہا— "بیوقوف وہ نہیں۔ اس نے اور اُس کی ماں نے آپ کو بیوقوف بنایا ہُوا ہے۔ آپ کی دولت لُٹ رہی ہے اور آپ اپنے جوان بیٹے سے بھی محروم ہو گئے ہیں۔ میں جو کہتا ہوں وہ کریں"۔

وہ سر جُھکا کر چلا گیا۔

زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ایک خوبصورت لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ ہر لحاظ سے خوبصورت تھی۔ زیادہ کشش جسم کی ساخت میں تھی اور

وہ خواجہ کی پوتی لگتی تھی۔

"یہاں بیٹھ جاؤ عائشہ!"— میں نے اُس کو کہا۔ وہ بیٹھ گئی تو میں نے کہا — "جھوٹ نہیں بولنا عائشہ اور مجھ سے ڈرنا نہیں۔ دیکھو' ایک جوان آدمی قتل ہو گیا ہے اور میں نے قاتل کو پکڑنا ہے۔ تم ایسی بیوقوفی نہ کرنا کہ کسی بات پر پردہ ڈال دو یا جھوٹ بول دو۔ مجھ کو تمہاری اور تمہاری ماں کی ہر بات معلوم ہے اور بشیر کے ساتھ تمہارا جو تعلق تھا وہ بھی معلوم ہے۔ مجھ کو اس سے کوئی غرض نہیں کہ تمہارا چال چلن کیسا ہے' تم نماز پڑھتی ہو یا دوسروں کے ساتھ عیش موج کرتی ہو۔ میری غرض یہ ہے کہ مجھ کو ہر بات سچ بتاؤ۔ جھوٹ بولو گی تو مجھ کو فوراً" پتہ لگ جائے گا اور قتل کے شک میں پکڑی جاؤ گی"۔

اس طرح میں نے اس کو پہلے تو ڈرایا پھر اس کے ساتھ بے تکلّفی کی باتیں شروع کر دیں جس میں ہمدردی کا رنگ زیادہ تھا۔ میں اس کو کہتا تھا کہ اس کے ساتھ بہت زیادتی ہوئی ہے۔ اس کی شادی بشیر کے ساتھ ہونی چاہئے تھی لیکن اس کی ماں نے اس کو ایک بوڑھے آدمی کے ساتھ بیاہ دیا۔ اس طرح کی میں نے اور بھی بہت سی باتیں کہیں۔ اس کے چال چلن سے تو میں واقف تھا لیکن اُس کو میں نے جنّتِ ارضی کی حُور ثابت کر کے اس کے دل اور دماغ پر قبضہ کر لیا۔ میں نے اس کو یہ یقین بھی دلایا کہ وہ جو کچھ بھی بتائے گی وہ اس کے خاوند کو یا کسی اور کو معلوم نہیں ہو سکے گا۔

"کیا تمہیں خواجہ صاحب نے کبھی بشیر کے ساتھ پکڑا تھا؟"— میں نے پوچھا۔

"اکٹھے بیٹھے ہوئے چار پانچ بار پکڑا تھا"— اس نے جواب دیا۔

"خواجہ صاحب نے کیا کہا؟"— میں نے پوچھا— "بشیر کو ڈانٹ پھٹکار کی ہو گی!"

"بہت!"— اس نے جواب دیا— "شروع شروع میں تو انہوں نے مجھ کو اتنا ہی کہا کہ بشیر کے ساتھ اس طرح مت بیٹھا کرو۔ مجھ کو سمجھاتے تھے کہ یہ تمہارا بیٹا ہے اور تم اس کی ماں ہو لیکن میرا دل نہیں مانتا تھا کہ جو آدمی مجھ سے ایک سال بڑا ہے' میں اس کو اپنا بیٹا سمجھوں۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ میں نے تو بشیر کے ساتھ شادی کرنی تھی۔ ہماری آپس میں بڑی گہری محبت تھی"۔

"یہ میں جانتا ہوں"— میں نے اس کی حوصلہ افزائی کرنے کے واسطے کہا— "میں یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ محبت کیسی تھی اور بشیر کے ساتھ تمہارا تعلق کس قسم کا تھا۔ تم یہ بتاؤ کہ خواجہ صاحب تمہیں کیا کہتے تھے اور کس طرح بشیر سے دُور رکھنے کی کوشش کرتے تھے"۔

"میں بشیر سے الگ نہیں رہ سکتی تھی"— اُس نے کہا— "آپس کی محبت کے علاوہ یہ بھی سوچیں کہ خواجہ صاحب کس عمر کے آدمی ہیں۔ پہلے تو خواجہ صاحب مجھ کو زبانی کلامی روکتے رہے اور جب دیکھا کہ میرے اوپر کوئی اثر نہیں ہو رہا تو انہوں نے دو مرتبہ مجھ کو مارا پیٹا۔ انہوں نے بشیر کو بہت ڈانٹا اور ایک روز بشیر بول پڑا اور خواجہ صاحب کے ساتھ بہت بدتمیزی کی۔ ایسا تین مرتبہ ہُوا"۔

"ذرا یاد کرو عائشہ!"— میں نے کہا— "خواجہ نے بشیر کو یہ بھی کہا تھا کہ وہ اس کو گھر سے نکال دیں گے اور جائیداد سے عاق کر دیں گے"۔

"ہاں جی!"— عائشہ نے کہا— "خواجہ صاحب تو اور ہی زیادہ خطرناک باتیں کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ یہ ہے تو میرا بیٹا لیکن اس کو میں کسی روز غائب کر دوں گا۔ یہ سن کر میں ڈر گئی۔ میں نے بشیر کو بتایا۔ اس کے دو روز بعد باپ بیٹے میں بہت لڑائی جھگڑا ہُوا"۔

"مارپٹائی بھی ہوئی تھی؟"

"مارپٹائی تو نہیں ہوئی"— اس نے جواب دیا— "اگر میں بیچ میں نہ آجاتی تو مار پٹائی بھی ہو جاتی لیکن ہُوا یہ کہ بشیر غصے میں باہر نکل گیا تو خواجہ صاحب نے میری پٹائی کر دی"۔

"تم اپنی ماں کو تو بتاتی ہو گی کہ خواجہ صاحب تمہیں مارتے پیٹتے ہیں"— میں نے پوچھا۔

"بتاتی تھی"— اُس نے کہا— "لیکن وہ مجھے تسلّی دلاسے دے کر بہلا لیتی تھی"۔

"وہ اور کیا کرتی!"— میں نے کہا— "شادی کا تو نام تھا' اُس نے دراصل تمہیں خواجہ کے ہاتھ بیچا تھا"۔

"مشکل تو یہی ہے ناجی!"— اُس نے کہا— "میری ماں نے تو میری قیمت وصول کی تھی.... اور سچی بات ہے جی کہ وہ اب تک خواجہ صاحب سے قیمت وصول کر رہی ہے"۔

میرے اُکسانے پر اور ہمدردانہ حوصلہ افزائی سے متاثر ہو کر اس نے مجھ کو پوری تفصیل سنا دی کہ وہ خود اور اس کی ماں کس طرح خواجہ کو لُوٹ رہی ہیں اور آگے چل کر وہ اس کی کچھ جائیداد بھی اپنے نام کروا لے گی۔ میں اگر اس کردار کو پوری طرح بیان کرنا چاہوں تو اڑھائی تین سو صفحوں کی ایک کتاب لکھ سکتا ہوں لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں ہو گی۔ اس قسم کی مائیں اور بیٹیاں آج بھی ہمارے معاشرے میں موجود ہیں اور دوسروں کے گھر اُجاڑ رہی ہیں اور قتل کی وارداتوں کا باعث بن رہی ہیں۔ خواجہ صاحب جیسے دولت مند بھی موجود ہیں جو بڑی خوشی سے ان کے جال میں آجاتے ہیں۔

مجھ کو یہ خوشی ہو رہی تھی کہ عائشہ پوری طرح میرے قبضے میں آگئی تھی اور ہر بات مجھ کو اپنا ہمدرد دوست سمجھ کر اُگلتی جا رہی تھی۔ میں نے اس سے

پوچھا کہ یہ لڑائی جھگڑا کب ہوا تھا۔ اس نے بتایا کہ بشیر کے لاپتہ ہونے سے تین روز پہلے کا یہ واقعہ ہے۔

"باپ بیٹے کی آپس میں بول چال بھی بند ہو گئی تھی"۔۔۔ عائشہ نے کہا ۔۔۔ "مجھ کو بہت خطرہ نظر آنے لگا کہ اب کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا۔ خواجہ صاحب کہتے تھے کہ میں اس لڑکے کو زندہ نہیں چھوڑوں گا اور بشیر کہتا تھا کہ میں ڈرتا ہوں کہ باپ میرے ہاتھوں قتل نہ ہو جائے۔ خواجہ صاحب نے اپنی بیٹیوں کو جا کر بتایا۔ ان کی بیٹیاں میرے پاس آئیں۔ کہتی تھیں کہ میں بشیر کو سمجھاؤں لیکن میں بڑی مجبور تھی۔ بشیر نہیں مانتا تھا۔ کہتا تھا کہ میں اسی گھر میں رہوں گا اور اس باپ کے واسطے یہ گھر جہنم بنا دوں گا"۔

راز کی ایک بات

"میرا خیال ہے عائشہ!"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "کہ بشیر کے دل میں تمہاری محبت اتنی گہری اُتری ہوئی تھی کہ وہ تمہاری خاطر اپنی جان بھی قربان کر سکتا تھا"۔

میں نے اس پر اپنا جادو پوری طرح چلانے کے واسطے بشیر کی مردانگی کی تعریفوں کے پُل باندھنے شروع کر دیئے اور اس کے ساتھ ہی عائشہ کے حُسن اور اس کی شخصیت کو اتنا زیادہ بڑھایا چڑھایا کہ وہ آپے سے باہر ہو گئی۔ یہ ایک ایسی کیفیت ہے جو کسی پر طاری کرنے کے واسطے بڑے پکّے استاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کا مجھ کو اچھا تجربہ تھا۔

"میں آپ کو کیا کیا بتاؤں!"۔۔۔ اُس نے رندھیائی ہوئی آواز میں کہا۔۔۔ "میرے پہلے خاوند سے میری جان چھڑانے کی خاطر بشیر نے اپنی جان کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔ یہ تو خدا کا شکر ہے کہ اصل بات کا کسی کو پتہ ہی نہیں لگا۔ آج

تک سب لوگ یہی کہتے ہیں کہ میرا پہلا خاوند چڑھے ہوئے نالے میں گر پڑا تھا اور ڈوب کر مر گیا تھا۔ وہاں اونچے کنارے پر کئی ایک لوگ کھڑے سیلاب دیکھ رہے تھے۔ بشیر نے میرے خاوند کے پیچھے سیلاب میں چھلانگ لگا دی۔ لوگ آج تک بشیر کی اس بہادری کی تعریفیں کرتے ہیں کہ بشیر میرے خاوند کو بچانے کی خاطر اتنے گہرے اور جوش میں آئے ہوئے سیلاب میں کود گیا تھا"۔

"یہ واقعہ میں نے سنا ہے"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "میں خود بشیر کو بہادر سمجھتا رہا ہوں"۔

"لیکن راز کی ایک بات ہے"۔۔۔ عائشہ نے کہا۔۔۔ "وہ تو بیچارہ دنیا سے اٹھ گیا ہے۔ اگر یہ راز آپ کو بتا دوں تو کوئی حرج نہیں۔ میرا خاوند تیرنا جانتا تھا۔ وہ ڈوبنے والا نہیں تھا اور نہ ہی کبھی کوئی اس سیلاب میں ڈوبا ہے۔ میری اس شادی کے بعد بشیر کی اور میری ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ وہ کہتا رہتا تھا کہ میں اسی سوچ میں گُم رہتا ہوں کہ تمہیں اس خاوند سے کس طرح آزاد کراؤں۔ مجھ کو تو وہ آدمی بالکل ہی اچھا نہیں لگتا تھا۔ میں کہتی تھی کہ یہ مر جائے تو ہی میری جان چھوٹے گی۔ وہ سیلاب میں ڈوب کر مر گیا تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا"۔

"راز کی کیا بات تھی؟"

"وہی بتانے لگی ہوں"۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ "میرے خاوند کے ڈوبنے کے ایک دو روز بعد بشیر سے میری بڑی لمبی ملاقات ہوئی۔ اس نے مجھ کو مبارکباد دی اور یہ بتایا کہ میرا خاوند سیلابی نالے کے اونچے کنارے سے پھسل کر سیلاب میں گر پڑا تو بشیر یہ نعرہ لگا کر سیلاب میں کود گیا کہ میں اسے ڈوبنے نہیں دوں گا۔ بشیر نے دراصل کیا یہ تھا کہ میرے خاوند کے نیچے جا کر اس کی دونوں ٹانگیں پکڑ لیں اور نیچے کو کھینچا۔ میرا خاوند پانی میں چلا گیا اور بشیر نے اوپر ہو کر

اس کو دبا لیا۔ لہریں بہت اونچی جاتی تھیں اور وہاں پانی کا زور بھی بڑا زیادہ تھا۔ اوپر سے کوئی دیکھ نہیں سکتا تھا کہ بشیر کیا کر رہا ہے۔ بشیر نے یہ کیا کہ میرے خاوند کو ڈبو دیا اور خود باہر نکل آیا اور شور شرابہ کیا۔ لوگ دوڑے آئے۔ میرے خاوند کی لاش کچھ دور آگے سے نکالی گئی تھی۔ بشیر نے لوگوں کو بتایا کہ وہ میرے خاوند کو بچانے کی کوشش کرتا تھا اور میرا خاوند گھبرا کر اس کے بازو پکڑ لیتا تھا۔ اس طرح وہ ڈوب گیا"۔

"کیا تم نے یہ بات کبھی کسی اور کو بتائی تھی؟" —— میں نے پوچھا۔

"نہیں" —— اس نے جواب دیا —— "میں نے یہی بات بشیر سے پوچھی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ صرف ایک دوست کو اس نے یہ بات بتائی تھی"۔

میرے پوچھنے پر عائشہ نے بشیر کے اس دوست کا نام بتا دیا۔

عائشہ کے ساتھ میری یہ گفتگو بہت ہی لمبی تھی۔ مجھ کو آج تک یاد ہے کہ رات کے گیارہ بج گئے تھے۔ میں اتنی لمبی گفتگو قلمبند کرنا ضروری نہیں سمجھتا۔ مختصر بات یہ ہے کہ اس نے میرے دل میں پکّا شک بٹھا دیا کہ بشیر کا قاتل اس کا اپنا باپ ہے۔

اتنے میں ہیڈ کانسٹیبل پوسٹمارٹم رپورٹ لے کر آ گیا۔ میں نے عائشہ کو کچھ ضروری باتیں بتا کر بھیج دیا۔ بڑی سختی سے اس کو کہا کہ وہ کسی سے ذکر نہ کرے کہ میرے اور اس کے درمیان کیا باتیں ہوئی ہیں۔ خواجہ کو میں ابھی چھیڑنا نہیں چاہتا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ کچھ شہادت اکٹھی ہو جائے تو میں خواجہ کو گرفتار کر لوں اور پھر اس سے پوچھ گچھ کروں گا۔

پوسٹمارٹم رپورٹ میں ڈاکٹر نے لکھا تھا کہ موت چھ یا غالباً" سات روز پہلے واقعہ ہوئی تھی۔ اس میں لاش کی حالت پوری طرح بیان کی گئی تھی۔ ایک

بات ایسی لکھی ہوئی تھی کہ مجھ کو اچھا خاصا دھکا لگا۔ بات یہ تھی کہ ڈاکٹر نے موت کا باعث یہ لکھا کہ مقتول کی کھوپڑی کے پیچھے سے ایئرگن کا ایک چھرّہ داخل ہُوا جو کھوپڑی میں سے گزر کر دماغ میں رک گیا۔ اسی طرح ایک اور چھرّہ کھوپڑی میں دائیں کان کے ذرا اوپر سے داخل ہُوا اور وہ بھی دماغ کے اندر جا کر رک گیا۔

ڈاکٹر نے دونوں چھرّے لفافے میں بند کر کے بھیجے تھے۔ تب مجھ کو پتہ لگا کہ سر سے خون کیوں نکلا تھا۔ میں نے دونوں چھرّے دیکھے۔ یہ ذرا ذرا پچکے ہوئے تھے اور یہ ایئرگن کے چھرّے Slugs تھے۔

آپ جانتے ہوں گے کہ ایئرگن کس طرح فائر ہوتی ہے۔ یہ ہوا کے زور سے فائر کرتی ہے لیکن اس کے چھرّے میں اتنی طاقت نہیں ہوتی کہ دُور سے چلایا جائے تو انسان کی کھوپڑی کو توڑ سکے۔ یہ صرف اس صورت میں مقتول کی کھوپڑی میں داخل ہوئے ہوں گے کہ ایئرگن کی نالی مقتول کے سر کے ساتھ لگی ہوئی تھی یا دو تین فٹ دور تھی۔ ان چھرّوں کے پیچھے بارود کا دھماکہ نہیں ہوتا کہ یہ کھوپڑی سے پار نکل جاتے۔ کھوپڑی نے ان کی رفتار سست کر دی اور دماغ نے چھرّوں کو اپنے اندر روک لیا۔

ایک پرانا قتل

یہ ایک اچھا سراغ مل گیا تھا۔ میں نے اب ان چھرّوں کو لاہور ماہرین کے پاس بھیجنا تھا اور وہاں سے رپورٹ حاصل کرنی تھی۔

اب میں نے یہ دیکھنا تھا کہ خواجہ کے گھر میں ایئرگن ہے یا نہیں یا ایئرگن کس کے پاس ہے۔ اتنے بڑے قصبے میں یہ معلوم کرنا کہ کون کون سے گھر میں ایئرگن ہے، کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ایئرگن کا لائسنس تو ہوتا ہی نہیں۔ ہر

کوئی رکھ سکتا ہے۔

میری اطلاع کے مطابق خواجہ کے گھر میں ایک نوکرانی اور دو نوکر تھے۔ میں نے ان سب کو بلوایا۔ پوسٹمارٹم کے بعد مقتول کی لاش گھر آگئی تھی اور ماتم کی آواز مجھے سنائی دے رہی تھی۔ تینوں نوکر آگئے۔ میں نے سب سے پہلے نوکرانی کو بلایا۔ وہ ادھیڑ عمر عورت تھی اور نمایاں طور پر کانپ رہی تھی۔ میں اس سے کوئی بات پوچھتا تھا تو وہ جواب دینے کی بجائے اِدھر اُدھر دیکھتی تھی جیسے بھاگ جانے کا راستہ دیکھ رہی ہو۔

اس کے بعد دونوں نوکروں کو باری باری بلایا۔ ان کا ردِّعمل بھی یہی تھا۔ ہر نوکر کے ساتھ جو سوال و جواب ہوئے وہ سنانے کی ضرورت نہیں۔ یہ سمجھ لیں کہ وہ بات کرتے اتنا ڈرتے تھے جیسے ان کو تھانیدار کا اتنا ڈر نہیں جتنا خواجہ کا ہے۔ میری حوصلہ افزائی سے انہوں نے جو کچھ بتایا وہ تقریباً وہی تھا جو مجھ کو دوسرے لوگوں سے اور عائشہ سے معلوم ہو چکا تھا۔ ان میں ایک جواں سال نوکر ذرا ہوشیار اور عقلمند لگتا تھا۔ اس نے کچھ ایسی باتیں کیں جو خواجہ کے حق میں جاتی تھیں۔ وہ کہتا تھا خواجہ بہت ہی عیاش اور بدکار آدمی ہے لیکن اپنے بیٹے کے ساتھ اسے بہت زیادہ محبت تھی۔

میں نے اس نوکر کو کہا کہ وہ اس دن کو یاد کرے جس دن بشیر گھر سے نکلا اور واپس نہیں آیا تھا۔

"وہ دن مجھ کو اچھی طرح یاد ہے جناب!"— اُس نے کہا — "وہ مجھ کو یہ کہہ کر گیا تھا کہ میں دو دوستوں کے ساتھ باہر جا رہا ہوں اور دوپہر تک واپس آجاؤں گا۔ میں نے اس کو کھیتوں کی طرف جاتے دیکھا تھا"۔

"کیا وہ اکیلا تھا؟"— میں نے پوچھا — "اگر وہ دوستوں کے ساتھ گیا تھا تو وہ کون کون تھے؟"

"میں نے اُس کو اکیلا ہی جاتے دیکھا تھا"۔

"اُس وقت خواجہ صاحب کہاں تھے"۔

"خواجہ صاحب اندر سوئے ہوئے تھے"— اس نے جواب دیا — "کہتے تھے جسم ٹوٹ رہا ہے"۔

اس نوکر کو میں نے کریدنے اور کھنگالنے کی بہت کوشش کی لیکن کوئی اور کام کی بات معلوم نہ ہوئی۔ عائشہ کی بابت اس نے بے زاری کے لہجے میں بتایا کہ خواجہ صاحب اپنے آپ کو بڑا استاد اور بادشاہ سمجھتے ہیں لیکن فضول سی ایک عورت اور اس کی بیٹی کے ہاتھوں لُٹ رہے ہیں اور عائشہ باپ کی بھی اور بیٹے کی بھی بیوی بنی ہوئی ہے۔

اس نوکر کی باتوں سے مجھ کو ایسے پتہ لگتا تھا جیسے یہ خواجہ کا خاص نوکر تھا اور خواجہ اس کے ساتھ ذاتی باتیں بھی کرتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا تو اس نے میرے اس خیال کی تصدیق کر دی۔

"میں آپ کو سچ بات بتاؤں؟"— اُس نے کہا — "دس بارہ روز ہو گئے ہیں میں خواجہ صاحب کی ٹانگیں دبا رہا تھا۔ خواجہ صاحب نے پی ہوئی تھی اور بڑے اچھے موڈ میں تھے۔ میرے ساتھ باتیں کرتے کرتے عائشہ پر بات آگئی تو کہنے لگے کہ میں شاید اس لڑکی کو طلاق دے دوں .... میں نے پوچھا کیوں خواجہ صاحب؟ انہوں نے کہا کہ میں بہت بڑی غلطی کر بیٹھا ہوں' یہ میرے بیٹے کو خراب کر رہی ہے اور کسی روز میرے بیٹے کو میرا دشمن بنا دے گی۔ میری اتنی جائیداد کا وارث میرا یہی ایک بیٹا ہی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ عائشہ کا بیٹا ہو جائے تو جائیداد ان چوروں کے پاس چلی جائے۔ میں نے ان کو کہا' خواجہ صاحب' اللہ نے آپ کو اتنا دیا ہے کہ اس لڑکی کو آپ ویسے ہی داشتہ بنا کر رکھ سکتے تھے .... لیکن جناب گھر میں وہی ہونے لگا جس کا خطرہ خواجہ صاحب کو نظر

آرہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ خواجہ صاحب بیٹے کو ڈانٹ پھٹکار تو کر دیتے تھے لیکن بہت پریشان رہنے لگے تھے۔ انہوں نے اپنی اس بیگم کی بھی خوب پٹائی کی تھی"۔

میں نے اس نوکر سے پوچھا کہ خواجہ کے گھر میں ائیرگن ہے یا بشیر نے ائیرگن رکھی ہوئی ہے؟ نوکر نے بتایا کہ ائیرگن نہیں ہے، دونالی بندوق ہے۔

رات گذر گئی تھی۔ میں نے ایک منٹ بھی آرام نہیں کیا تھا۔ میں تھانے چلا گیا اور تھانے میں یہ کہہ کر اپنے گھر گیا کہ کچھ مخبروں کو بلایا جائے اور خواجہ کے تینوں غنڈوں کو بھی بلا کر بٹھا لیا جائے۔ گھر جا کر میں نہایا اور تقریباً دو گھنٹے آرام کیا۔ واپس تھانے آیا تو تین مخبر آئے بیٹھے تھے۔

مجھ کو بشیر کا وہ دوست یاد آگیا جس کا نام عائشہ نے لیا تھا اور کہا تھا کہ بشیر نے اس کو بتایا تھا کہ اس نے عائشہ کے پہلے خاوند کو ڈبو کر مارا تھا۔ میں نے اس دوست کو بلوا لیا۔ اُس کے آنے تک مخبروں کو اپنے پاس بٹھا کر کہا کہ معلوم کریں کہ ائیرگن کس کے پاس ہے۔ ان کو اور بھی کچھ ہدایات دیں۔

بشیر کا وہ دوست آگیا۔ میں نے اس کو اپنے پاس بٹھا لیا۔ یہ پہلے بھی میرے پاس آچکا تھا۔

"میں پہلے بھی تمہیں بلا چکا ہوں" — میں نے اس سے کہا — "اُس وقت بات اور تھی کہ بشیر لاپتہ ہے۔ اب وہ قتل ہو چکا ہے۔ تم بھی میری طرح چاہتے ہو گے کہ قاتل کو پکڑ کر پھانسی کے تختے پر کھڑا کیا جائے۔ اب دماغ پر زیادہ زور دو اور مجھ کو چھوٹی چھوٹی باتیں بھی بتاؤ.... کیا تمہیں بشیر نے بتایا تھا کہ اس نے عائشہ کے خاوند کو سیلاب سے بچانے کے بہانے اس کو ڈبو کر مار دیا تھا؟.... وہ اب دنیا میں نہیں۔ یہ راز لوگوں کے سامنے آ بھی گیا تو کچھ نہیں ہو گا لیکن میں کسی کو پتہ ہی نہیں لگنے دوں گا کہ تم نے مجھ کو اس بابت کچھ بتایا

ہے"۔

"میں آپ سے کچھ بھی نہیں چھپاؤں گا صاحب!" — اُس نے کہا — "یہ راز ایک نہیں دو ہیں۔ عائشہ کا خاوند نالے کے کنارے سے ویسے ہی نہیں گر پڑا تھا۔ اس کو گرایا گیا تھا۔ یہ راز صرف میرے پاس ہے۔ بشیر اکثر کہا کرتا تھا کہ عائشہ کو کس طرح خاوند سے نجات دلواؤں۔ وہ قتل کے ایسے طریقے سوچتا رہتا تھا کہ یہ پتہ ہی نہ لگے کہ یہ قتل کی واردات ہے لیکن کوئی طریقہ ٹھیک نہیں لگتا تھا....

"نالے میں سیلاب آیا تو بشیر، میں اور ہمارا ایک اور دوست بارش رُکنے کے بعد نالے کے کنارے کنارے وہاں تک چلے گئے جہاں دس بارہ آدمی کھڑے، چڑھے ہوئے نالے کو دیکھ رہے تھے۔ وہاں بہت اونچائی ہے اور وہاں نالے کا موڑ ہے۔ پاٹ بھی تنگ ہے جس وجہ سے وہاں سیلاب کا زور اور جوش دیکھنے والا ہوتا ہے۔ ان آدمیوں میں عائشہ کا خاوند بھی تھا جو کنارے کے بہت قریب کھڑا تھا۔ بشیر اس کے قریب رک گیا۔

"تماشائیوں کے پیچھے دو کُتے آپس میں اچانک لڑ پڑے۔ سب تماشائیوں نے پیچھے دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی بشیر کی سخت گھبرائی ہوئی آواز آئی — 'بھولا گر پڑا ہے.... ڈوب جائے گا.... بھولا گیا' — سب نے نیچے دیکھا۔ بھولا (عائشہ کا خاوند) ڈبکیاں کھاتا اور ہاتھ پاؤں مارتا جا رہا تھا۔ بشیر سیلاب میں کُود گیا۔ میں تو حیران ہو گیا کہ بشیر نے یہ کیا کیا؟ وہ جس کو قتل کرنا چاہتا تھا اس کو بچانے کے واسطے خطرے میں کود گیا۔ لوگوں کو تو پتہ ہی نہیں تھا۔ وہ بشیر کی تعریفیں کر رہے تھے....

"آگے جا کر پاٹ چوڑا اور کنارے نیچے تھے۔ سب اُدھر دوڑتے گئے۔ بشیر نے بھولے کو سیلاب سے نکال کر زمین پر لٹایا ہُوا تھا۔ سب خوش تھے کہ بشیر

نے بھولے کو بچالیا ہے لیکن جا کر دیکھا تو بھولا مرا ہُوا تھا۔ بشیر نے سب کو بتایا کہ بھولا اس کو بھی اپنے ساتھ ڈبو رہا تھا۔ سب نے اس کا بیان سچ مان لیا....

"بعد میں بشیر نے مجھ کو بتایا کہ جب کُتے لڑ پڑے اور سب نے اُدھر دیکھا تو بشیر نے بھولے کو اپنا کولہا مار کر سیلاب میں گرایا تھا۔ بھولا عین کنارے پر کھڑا تھا۔ وہ آسانی سے گر پڑا۔ بشیر اس کے پیچھے اس کو بچانے کے واسطے نہیں بلکہ اس کو ڈبو کر مارنے کے واسطے سیلاب میں کودا تھا۔ اُس نے مجھ کو یہ بھی بتایا تھا کہ جب وہ بھولے کو سیلاب سے باہر لایا تھا اُس وقت وہ سانس لے رہا تھا اور بیہوش تھا۔ بشیر نے اس کے ناک اور منہ پر ہاتھ رکھ کر اس کو مارا تھا"۔

بشیر کے اس دوست نے پوری طرح سنایا کہ بشیر نے بھولے کو کس طرح ڈبویا اور پھر کس طرح مارا تھا اور اس نے لوگوں کو جو بیان دیا' وہ بھی پورا سنایا تھا۔ بشیر نے اگر بھولے کو قتل ہی کیا تھا تو یہ میری دلچسپی کا کیس نہیں تھا۔ میرے پاس قتل کی اس واردات کی کوئی رپورٹ نہیں تھی۔ یہ واردات ایک سال پرانی ہو گئی تھی۔ میرے سامنے بشیر کے قتل کی واردات تھی۔

راز جو راز نہ رہا

میرے اندر سراغرسانی والی جو رگ تھی وہ تو پہلے ہی بیدار تھی' اب یہ بات سُن کر کہ بشیر نے عائشہ کے خاوند کو قتل کیا تھا یہ رگ پوری طرح بیدار ہو گئی۔ مجھ کو یہ سوچ آئی کہ ہو سکتا ہے یہ بات بھولے کے بھائیوں وغیرہ تک پہنچ گئی ہو کہ اس کو بشیر نے ڈبو کر مارا تھا۔

غور کریں' بشیر نے عائشہ کو یہ بات بتائی اور اپنے اس دوست کو بھی بتائی تھی۔ دانشمند کہتے ہیں کہ کوئی بات مشہور کرنی ہو تو کسی ایک عورت کو وہ بات سنا دو۔ اگر کسی مرد کو سناؤ تو بھی راز راز نہیں رہتا۔ یہ انسانی فطرت کی ایسی خاصیت ہے کہ اس پر انسان کا کنٹرول نہیں رہتا۔

میرے اندر یہ شک پیدا ہو گیا کہ بھولے کے بھائیوں وغیرہ نے اب انتقام لیا ہے۔ مجھ کو یہ باتیں معلوم کرنی تھیں۔ ایک یہ کہ ان لوگوں کو یہ معلوم ہو گیا ہے یا نہیں کہ بھولے کو بشیر نے قتل کیا تھا' اور دوسری بات یہ کہ بھولے کے اگر بھائی ہیں تو وہ کس فطرت کے ہیں۔ کیا وہ قتل کی ہمت رکھتے ہیں؟

"ایک بات بتاؤ"— میں نے بشیر کے اس دوست سے پوچھا— "کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ بھولے کے قتل کی واردات صرف تمہارے دل میں ایک راز ہے؟"

"نہیں جناب!"— اس نے جواب دیا— "کبھی میرا خیال تھا کہ صرف میں ہی اس راز سے وقف ہوں لیکن بشیر میں یہ خرابی تھی کہ کوئی بات دل میں نہیں رکھتا تھا۔ بڑھکیں بھی مارا کرتا تھا۔ ہمارے دوسرے دوستوں کو بھی اس واردات کا علم تھا۔ بشیر نے مجھ کو بتایا تھا کہ اس نے یہ بات عائشہ کو بھی بتا دی ہے۔ مجھ کو یقین ہے کہ عائشہ نے اپنی ماں کو ضرور بتائی ہو گی۔ عائشہ اور اس کی ماں اوچھی عورتیں ہیں۔ انہوں نے اس بات کو معلوم نہیں کہاں کہاں پھیلایا ہو گا"۔

"اب ایک اور بات بتاؤ"— میں نے پوچھا— "کیا بشیر کے محلّے میں یا بھولے کے محلّے میں کسی کے پاس ایئرگن ہے؟ اگر تم نہیں جانتے تو میرے واسطے جاسوسی کرو"۔

وہ شہر جیسے قصبے کا رہنے والا تھا۔ پڑھا لکھا بھی تھا۔ وہ جانتا تھا ایئرگن کیا ہوتی ہے۔

"ایک کو تو میں جانتا ہوں"— اس نے کہا— "وہ ساتھ والے محلّے کا رہنے والا ہے۔ انڈین ایئرفورس میں کارپورل ہے۔ اُس کے پاس ایئرگن ہے۔

جب کبھی چھُٹی آتا ہے تو ایئرگن لے کر باہر نکل جاتا ہے اور پرندے مار لاتا ہے"۔

ایئرفورس کا کارپورل فوج کا نائیک سمجھ لیں۔ نائیک کی طرح وردی کے بازوؤں پر دو بتیاں لگاتا ہے۔ جنہیں سٹرائپ کہتے ہیں۔ یہ کارپورل مسلمان تھا۔

"وہ کب چھُٹی آیا تھا؟"— میں نے پوچھا— "کیا اُن دنوں آیا تھا؟"

"ہاں جی!"— اُس نے جواب دیا— "بشیر لاپتہ ہُوا تو وہ یہیں تھا۔ مجھ کو یہ بھی معلوم ہے کہ وہ دس دن کی چھُٹی آیا تھا۔ پرسوں ترسوں واپس گیا ہے۔ وہ منگنی کرانے آیا تھا۔ منگنی ہو گئی ہے"— وہ چپ ہو گیا جیسے اُس کو کچھ یاد آگیا ہو، پھر اُس نے کہا— "اس کی منگنی بھولے کی بہن کے ساتھ ہوئی ہے"۔

"ان کی آپس کی رشتہ داری ہے؟"

"نہیں!"— اس نے جواب دیا— "ذات ایک ہی ہے، ویسے بھولے کے بڑے بھائی کے ساتھ اس کی بڑی گہری دوستی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ منگنی ان کی دوستی کی وجہ سے ہوئی ہے"۔

میں نے اس سے کچھ اور باتیں پوچھیں لیکن وہ مزید کچھ نہیں بتا سکا۔ میں نے اس کو کہا کہ میرے ساتھ اس کی جو باتیں اور سوال جواب ہوئے ہیں، یہ کسی اور کو نہ بتائے اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ جس روز بشیر لاپتہ ہُوا تھا اس روز وہ کس کے ساتھ باہر گیا تھا اور کیا کسی نے اُس کو کسی طرف جاتے دیکھا تھا؟ کچھ اور باتیں سمجھا کر اس کو رخصت کر دیا۔

خواجہ کے ایک نوکر نے بتایا تھا کہ بشیر اس کو بتا کر گیا تھا کہ وہ دو دوستوں کے ساتھ جا رہا ہے اور دوپہر تک واپس آجائے گا۔ نوکر نے اس کو کھیتوں کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ مجھ کو سوچ آئی کہ اگر اس نے نوکر کو بتایا تھا تو عائشہ کو

ضرور بتایا ہو گا۔ میں نے اُسی وقت ایک ہیڈ کانسٹیبل کو بلا کر کہا کہ عائشہ کو اپنے ساتھ لے آئے۔ میں نے بڑی تیزی سے ہر کارروائی کرنی تھی۔ یہ اب قتل کا کیس تھا۔

میں نے خواجہ کو ذہن سے نہیں نکالا تھا۔ وہ میرا مشتبہ تھا لیکن ایئرگن کے دو چھرّوں نے میرے دماغ کو کسی اور طرف کر دیا تھا۔ خواجہ کے غنڈوں کو میں نے تھانے میں بٹھایا ہُوا تھا۔ ان کو معلوم نہیں کتنے دن بٹھائے رکھنا تھا۔ میں نے اے ایس آئی کو کہا کہ ان کے گھروں میں اطلاع کر دو کہ ان کا کھانا تھانے پہنچا دیا کریں۔

عائشہ آگئی۔ اُس کے ساتھ ایک نوکر بھی تھا۔ عائشہ کی آنکھیں اور چہرہ بتا رہا تھا کہ بہت روتی رہی ہے۔

"وہ دن یاد کرو عائشہ جس دن بشیر گھر سے نکلا اور واپس نہیں آیا"— میں نے کہا— "وہ تمہیں کچھ بتا کر نکلا تھا"۔

اُس نے اپنے دماغ پر زور دیا جو اس کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا۔

"ہاں جی!"— اُس نے کہا— "کہتا تھا دو دوستوں کے ساتھ جا رہا ہوں۔ کھانا واپس آکر کھاؤں گا"۔

"یہ نہیں بتایا وہ دوست کون ہیں؟"— میں نے پوچھا— "اور وہ کہاں جا رہا ہے؟"

"نہیں!"— اُس نے جواب دیا— "وہ بڑی جلدی میں باہر نکل گیا تھا"۔

"تم نے اپنی ماں کو بتایا تھا کہ بشیر نے تمہارے خاوند بھولے کو ڈبو کر مارا تھا"— میں نے کہا— "بیٹیاں ہر بات اپنی ماؤں کو ضرور بتاتی ہیں"

"نہیں بتانا چاہئے تھا؟"— اُس نے پوچھا۔

"میں نے ویسے ہی کہا ہے"— میں نے بے پرواہی سے کہا— "بتا دیا تھا

تو کیا ہُوا!!"

میں نے اُس کے ساتھ اس طرح باتیں کیں کہ وہ سمجھ نہ سکی کہ میرا مقصد کیا ہے۔ میں یہ معلوم کرنا چاہ رہا تھا کہ اس کی ماں نے یہ بات ظاہر کر دی ہو گی اور یہ راز عائشہ کے پہلے سسرال تک پہنچ گیا تھا۔ عائشہ نے صاف بات تو نہیں کی لیکن مجھ کو یہ یقین ہو گیا کہ اس کی ماں نے اس راز کو راز نہیں رہنے دیا تھا۔

عائشہ کو میں نے گھر بھیج دیا۔

انڈین ائیرفورس کا کارپورل

میں نے دو معزّزین کو تھانے بلوایا۔ وہ آئے تو ان سے بھولے کے گھر کی باتیں پوچھیں۔ میرا دماغ ایک خاص لائن پر کام کر رہا تھا اور میرے دماغ پر ائیرگن سوار تھی۔

مجھ کو بتایا گیا کہ بھولے کے بڑے بھائی رحمان کی بڑی گہری دوستی انڈین ائیرفورس کے کارپورل سلیم کے ساتھ ہے۔ سلیم رحمان کی چھوٹی بہن کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا لیکن رحمان کے والدین سلیم کو یہ رشتہ دینے پر راضی نہیں تھے۔ رحمان اور سلیم کی دوستی بڑی گہری ہے۔ رحمان نے اپنے والدین کے ساتھ ایسی شدید ناراضگی کا اظہار کیا جس کو والدین برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اپنے بیٹے کی خوشی کے واسطے انہوں نے اپنی بیٹی کی منگنی سلیم کے ساتھ کر دی۔

میں اب بات کو اس طرح لمبا نہیں کرنا چاہتا کہ فلاں بات فلاں شخص سے معلوم ہوئی، میں نے کیا پوچھا، اس نے کیا جواب دیا۔ میں مختصر بات سناتا ہوں لیکن آپ یہ نہ سمجھ لینا کہ یہ کام آسان تھا۔ میرا دماغ اتنا زیادہ سوچتا تھا کہ سر

میں درد شروع ہو جاتا تھا۔

ایک ہی دن میں مجھ کو بہت ساری باتیں معلوم ہو گئیں۔ کارپورل سلیم جو اُن دنوں پشاور ہوتا تھا، جب کبھی چھُٹی آتا تو رحمان کو ساتھ لے کر پرندوں کے شکار کو ضرور جاتا تھا۔ اس کے پاس ائیرگن ہوتی تھی۔

بشیر اور سلیم کی آپس میں بڑی اچھی سلام دعا تھی۔ دو مخبروں نے بتایا کہ بشیر کی گمشدگی کے دن سے ایک یا دو دن پہلے بشیر کو سلیم اور رحمان کے ساتھ دیکھا گیا تھا۔

کار آمد بات یہ معلوم ہوئی کہ گمشدگی کے دن بشیر کو کھیتوں میں سے گزرتے دیکھا گیا تھا۔ وہ اس طرف جا رہا تھا جس طرف وہ جگہ تھی جہاں سے اس کی اَدھ کھائی لاش ملی تھی۔ یہ تو خواجہ کے نوکر نے مجھ کو پہلے ہی بتا دیا تھا۔ اس کے علاوہ میرا ایک مخبر ایک ایسے آدمی کو میرے پاس لے آیا جس نے بشیر کو اُدھر جاتے دیکھا تھا اور ایک اور طرف کارپورل سلیم کو اور رحمان کو اُسی سمت کو اکٹھے جاتے دیکھا لیکن وہ بشیر سے دور تھے۔

ایسی شہادت ایک بھی نہیں ملی کہ ان تینوں کو کہیں اکٹھے دیکھا گیا تھا۔

رحمان کی بابت یہ معلوم ہُوا کہ دلیر آدمی ہے اور غنڈے اور بدمعاش بھی اس کی عزت کرتے ہیں۔ وہ اپنا رعب رکھنے والا اور اپنی عزت اور غیرت پر مر مٹنے والا آدمی ہے۔

اس شہادت اور ان معلومات سے میرا کیس اتنا سا بھی نہیں بنتا تھا کہ میں رحمان کو مُشتبہ سمجھ کر تھانے بلاتا۔ سوچ سوچ کر میں نے اس کو تھانے بلا لیا۔ اس کی بابت تو سنا تھا کہ دلیر آدمی ہے لیکن میرے سامنے آ کر وہ گھبراہٹ اور ڈر کو چھپا نہیں سکا۔ وہ جب بولا تو اس کی زبان اس کے قابو میں نہیں تھی۔

"ڈرو نہیں رحمان!" ــــ میں نے اس کو کہا ــــ "میں نے تمہیں کسی تفتیش کے سلسلے میں نہیں بلایا نہ تمہارا کسی واردات کے ساتھ کوئی تعلق ہے۔ ایک عجیب بات معلوم ہوئی ہے۔ میں تم سے پوچھنا چاہتا تھا کہ تمہیں بھی معلوم ہے یا نہیں۔ تمہارا چھوٹا بھائی بھولا ڈوب کر مرا تھا اور بشیر نے اس کو بچانے کی کوشش کی تھی۔ مجھ کو اب پتہ لگا ہے کہ بشیر نے اس کو بچایا نہیں تھا بلکہ اس کو ڈبویا تھا۔ میرا خیال ہے تمہیں یہ پتہ نہیں"۔

"نہیں جی!" ــــ اس نے کچھ اور بھی کہنے کی کوشش کی لیکن زبان اُس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

"میں تو خوش ہوں رحمان!" ــــ میں نے کہا ــــ "اگر تمہارے بھائی کو بشیر نے ڈبویا تھا تو دیکھ لو وہ خود کیسے خوفناک انجام کو پہنچا ہے۔ اس کی لاش گیدڑوں اور کتُوں نے کھائی ہے۔ مجھ کو تمہارے ساتھ ہمدردی ہے۔ تم لوگوں نے غلطی کی تھی کہ بشیر کی باتوں میں آگئے۔ میں جانتا ہوں کہ اس سیلاب میں ایسا کوئی آدمی ڈوب نہیں سکتا.... کیا تمہارا بھائی تیرنا نہیں جانتا تھا؟"

"جانتا تھا جی!" ــــ اُس نے جواب دیا۔

"رحمان بھائی!" ــــ میں نے دوستوں کی طرح کہا ــــ "تم میرے مسلمان بھائی ہو' اس جذبے سے تمہارے ساتھ یہ بات کی ہے ورنہ مجھ کو کیا' کوئی مرے کوئی جیئے۔ ویسے تم لوگ بہت شریف ہو یا بیوقوف ہو۔ تم اُس وقت تھانے میں آجاتے اور کہتے کہ تمہیں شک ہے کہ تمہارے بھائی کو قتل کیا گیا ہے"۔

"اس وقت ذرا سا بھی شک نہیں ہُوا تھا" ــــ اُس نے کہا۔

"لیکن میرے بھائی!" ــــ میں نے بناوٹی آہ لے کر کہا ــــ "جس طرح کسی کی لکھی ہوتی ہے وہ اسی طرح دنیا سے جاتا ہے"۔

وہ مجھ سے ڈرا ہُوا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ تھانیدار تو دوستوں کی طرح بول رہا ہے تو اُس کی زبان چل پڑی۔

"یہ تو صدمے والی بات ہے کہ تمہارا بھائی فوت ہو گیا ہے" ــــ میں نے کہا ــــ "لیکن اچھی بات یہ ہوئی کہ یہ لڑکی عائشہ تمہارے گھر سے نکل گئی۔ بڑے گندے چال چلن کی لڑکی ہے۔ تم شریف لوگ ہو"۔

اس طرح چکنی چپڑی باتیں کرتے کرتے میں نے اُس سے کہلوا لیا کہ دو اڑھائی مہینے پہلے اُس کو پتہ لگا تھا کہ اس کے بھائی کو بشیر نے ڈبو کر مارا تھا۔

"لیکن اتنے عرصے بعد معلوم ہونے کا کوئی فائدہ نہیں تھا" ــــ میں نے کہا ــــ "چلو' قاتل کو سزائے موت مل گئی ہے.... تم چلو رحمان! اپنا کام کاج کرو اور صدمہ پی جاؤ"۔

میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ وہ اس اطمینان کے ساتھ گیا ہے کہ اس پر شک نہیں کیا جا رہا۔

میں نے دوسری کارروائی یہ کی کہ ڈاک خانے گیا اور پوسٹ ماسٹر کو رحمان کے گھر کا ایڈریس دے کر کہا کہ اس ایڈریس پر کوئی بھی خط آئے وہ مجھ کو تھانے میں دیا جائے اور یہ راز رہے۔

پھر اُس سے پوچھا کہ یہاں سے باہر جانے والی ڈاک کتنے بجے لیٹر بکس سے نکالی جاتی ہے۔ اُس نے وقت بتایا تو میں نے اس کو حکم سنایا کہ اُس وقت میرا اے ایس آئی آجایا کرے گا اور تمام ڈاک دیکھا کرے گا۔ کوئی خط کھولا نہیں جائے گا۔ صرف ایک ایڈریس والا خط روکا جائے گا۔

یہ ایڈریس کارپورل سلیم کا تھا۔

خطوط نے پردہ اٹھادیا

میرے پاس خواجہ کے تین غنڈے تھے جن میں ایک سزایافتہ عادی مجرم تھا۔ ان کے ساتھ ہمارا رویّہ کچھ اور ہوتا تھا۔ یہ لوگ ہمارے کام بھی آیا کرتے تھے۔ بڑی کار آمد مخبری کرتے تھے۔ میں نے دو دن اور دو راتیں ان پر لگا دیں لیکن نتیجہ صفر رہا۔ یہ مجھ کو یقین دلاتے تھے کہ خواجہ نے اپنے بیٹے کو قتل نہیں کرایا۔

میں نے تنہا بیٹھ کر اور پھر اپنے جونیئر سب انسپکٹر راجہ افراسیاب خان کو پاس بٹھا کر بہت سوچا اور واردات کا بال بال الگ الگ کر کے اس پر غور کیا۔ ہمارے دماغ ہمیں ہر زاویے سے ہوتے ہوئے اس ایک نقطے پر لے آتے تھے کہ خواجہ اپنے بیٹے کو قتل کرواتا تو ایئرگن استعمال نہ کرتا۔ اس کے پاس دو نالی والی بندوق تھی' یا وہ ایسا طریقہ اختیار کرتا کہ لاش کا سراغ ہی نہ ملتا۔

ہر پہلو کو دیکھا۔ مخبروں کی اور دوسرے لوگوں اور خواجہ کے ایک قابل اعتماد نوکر کی باتیں بھی سنیں۔ خواجہ بے گناہ معلوم ہوتا تھا۔

بیٹے کو دفن کرنے کے تین چار دنوں بعد خواجہ تھانے آیا۔ وہ ان چند دنوں میں ضعیف العمر نظر آنے لگا تھا۔ اس کی چال ڈھال بھی اسّی نوّے سال عمر کے بوڑھوں جیسی ہو گئی تھی۔ بیٹے کی گمشدگی کی رپورٹ لکھانے آیا تھا تو اس کا انداز اور جوش و خروش جوانوں جیسا تھا۔ وہ رعب سے بات کرتا تھا لیکن اب اس کی حالت یہ تھی کہ میرے سامنے آکر اس طرح کرسی پر بیٹھا جس طرح کوئی بہت ہی تھکا ہوا انسان گر پڑنے کی طرح بیٹھتا ہے۔ کچھ دیر تو وہ بولا ہی نہیں۔ میری طرف دیکھتے دیکھتے اُس کے آنسو نکل آئے۔

"کوئی سراغ ملا؟"— اُس نے بڑی کمزور آواز میں پوچھا۔

"مل جائے گا خواجہ صاحب!"— میں نے کہا— "دن رات ایک کر دیا ہے۔ قاتل نہیں بچ سکے گا"۔

"کمر ٹوٹ گئی ہے محبوب صاحب!"— اُس نے کہا اور ایسا رویا کہ میں پریشان ہو گیا۔

اُس کی سسکیاں اور ہچکیاں کنٹرول میں نہیں آتی تھیں۔ کچھ دیر بعد ہی اپنے آپ میں آیا۔

"میں بیوی کو طلاق دے رہا ہوں"— اُس نے کہا— "یہ حادثہ اسی کی وجہ سے ہُوا ہے.... یہ میرا گناہ تھا محبوب عالم صاحب! لیکن سزا میرے بیٹے کو ملی۔ ایک بیٹا ہی تو میری دولت تھی"۔

"ابھی طلاق نہ دیں"— میں نے اس کو مشورہ دیا— "اس میں آپ کی ہی بدنامی ہے۔ یہ کام کریں کہ اس لڑکی کو اپنے پاؤں کے نیچے دبالیں اور اس کی ماں کو اپنے گھر میں آنے سے روک دیں"۔

"میں تو اپنے بیٹے کی قبر پر جاتے ہوئے بھی شرماتا ہوں"— اُس نے کہا۔

"حوصلہ مضبوط کریں خواجہ صاحب!"— میں نے کہا— "ابھی کوئی فیصلہ نہ کریں۔ آپ کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں"۔

ایسی ہی رنج و غم کی باتیں کر کے وہ چلا گیا۔ مجھ کو خیال آیا کہ انسان اُس وقت سمجھتا ہے جب پہاڑ اس پر آگرتا ہے اور اُس وقت توبہ کے دروازے بند ہو چکے ہوتے ہیں۔

دو یا تین روز گزرے ہوں گے کہ ڈاک خانے سے ایک لفافہ ڈاک خانے کے لفافے میں بند ایک ڈاکیہ لایا اور مجھ کو دے گیا۔ میں نے کھولا۔ یہ خط پشاور سے کارپورل سلیم کی طرف سے تھا اور رحمان کو لکھا گیا تھا۔ آج مجھ کو پوری عبارت اور الفاظ تو یاد نہیں رہے' مطلب کی بات اچھی طرح یاد ہے۔

خط سے یہ ظاہر ہُوا کہ رحمان نے سلیم کو لکھا تھا کہ بشیر کی لاش برآمد ہو گئی ہے اور تفتیش ہو رہی ہے۔ رحمان نے یہ بھی لکھا تھا کہ پولیس تفتیش میں ناکام ہو جائے گی۔

کوئی ایسے الفاظ نہیں لکھے گئے تھے جن سے اصل راز ظاہر ہوتا لیکن اصل مطلب سمجھنا مشکل نہیں تھا۔ سلیم نے لکھا تھا کہ تم بے فکر رہو۔ یہ بھی لکھا تھا کہ خط بہت احتیاط سے لکھا کرنا۔

تقریباً" تین گھنٹے بعد اے ایس آئی ڈاک خانے سے ایک اور خط لایا۔ یہ خط رحمان کی طرف سے سلیم کو پوسٹ کیا گیا تھا۔ ڈاک نکلنے کے وقت اے ایس آئی ڈاک خانے چلا گیا تھا۔ تمام ڈاک چیک کرنے پر اس کو کارپورل سلیم کے نام ایک لفافہ مل گیا۔ میں نے کھول کر پڑھا۔

رحمان نے لکھا تھا کہ میں تمہیں یہ اطلاع دے چکا ہوں کہ بشیر کی لاش برآمد ہو گئی ہے۔ کل مجھ کو تھانے بلایا گیا تھا۔ میں بہت ہی ڈرا لیکن میں بہت حیران ہُوا کہ تھانیدار نے میرے ساتھ ہمدردی کی باتیں کیں اور مجھ کو رخصت کر دیا.... رحمان کے ساتھ میں نے جو باتیں کی تھیں' وہ اس نے ذرا مختصر کر کے سلیم کو لکھی تھیں۔ اس کے بعد اس نے اپنی رائے لکھی تھی کہ تھانیدار کے اس روّیے سے مجھ کو تسلّی ہو گئی ہے۔ آپ بھی تسلی میں رہیں۔

مجھ کو اصل الفاظ اور فقرے اب یاد نہیں رہے۔ اصل مطلب اور لب لباب یاد ہے۔ ان دونوں خطوط سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ یہ دونوں بشیر کے قتل کے ملزم ہیں۔ میری یہ چال کامیاب رہی کہ میں نے رحمان کو بلا کر ہمدردی کی باتیں کی تھیں۔ میں نے سوچا تھا کہ یہ قتل کا ملزم ہُوا تو سلیم کو ضرور خط لکھے گا۔

میں نے خواجہ کے غنڈوں کو چھٹی دے دی اور ایک کانسٹیبل کو بھیجا کہ

رحمان کو اپنے ساتھ لے آئے۔ میں خود یہ دونوں خط لے کر ڈی ایس پی کے پاس چلا گیا۔ وہ انگریز تھا۔ جرائم کے معاملے میں بہت ہی سخت آدمی تھا۔ تفتیش میں کوتاہی کرنے والے تھانیدار کو تو معاف کرتا ہی نہیں تھا۔

قتل کی اس واردات کی رپورٹ اُس تک پہنچی ہوئی تھی اور میری روز بروز تفتیش کی رپورٹ اُس تک پہنچتی رہتی تھی۔ انگریز افسروں کے طور طریقے پاکستانی افسروں جیسے نہیں ہُوا کرتے تھے۔ کام کے معاملے میں وہ افسری ماتحتی کو بھول جایا کرتے تھے۔ اُس کو میری اطلاع دی گئی تو اس نے مجھ کو فوراً" بلا لیا۔

"کس واسطے آیا؟" ـــ اُس نے پوچھا ـــ "کچھ کیا ہے یا صرف بات بولے گا؟"

"بہت کچھ کیا ہے صاحب بہادر!" ـــ میں نے کہا ـــ "آپ کا حکم چاہیۓ"۔

اُس نے مجھ کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے بیٹھ کر اُس کو بتایا کہ میں نے رحمان کو بلا کر کیا باتیں کی تھیں اور پھر ڈاک چیک کرنے کا کیا انتظام کیا۔ اس کے نتیجے میں یہ دو خط ملے ہیں.... دونوں خط اُس کے آگے رکھے۔ وہ اردو بول اور سمجھ سکتا تھا' پڑھ نہیں سکتا تھا۔ اُس نے کہا کہ خطوط پڑھ کر سناؤں۔ میں نے دونوں پڑھ کر سنائے۔

"گُڈ!" ـــ اُس نے کہا ـــ "دونوں کو پکڑو"۔

میں نے اس کو بتایا کہ کارپورل سلیم کو پشاور جا کر پکڑنے کے واسطے اس کے کمانڈنگ آفیسر کے نام سرکاری چٹھی کی ضرورت ہے۔ اُس نے پی اے کو بلایا اور اُس کو کہا کہ وہ چٹھی تیار کر دے۔

بشیر قبر تک جا پہنچا

میں چٹھی لے کر تھانے آیا تو رحمان میرے انتظار میں بیٹھا ہُوا تھا۔ اُس نے بے تکلّف دوستوں کی طرح میرے ساتھ ہاتھ ملایا۔ میں دوستوں کی ہی طرح اُس کو ملا اور اُس کا ہاتھ پکڑے ہوئے اس کو اپنے دفتر میں لے گیا۔

"بیٹھ جاؤ رحمان!"— اُس کو بٹھا کر کہا— "مجھ کو اپنا ہمدرد اور دوست سمجھو۔ میں دوستی کا حق ادا کروں گا' شرط یہ ہے کہ تم یہ بتا دو کہ بشیر کے سر میں ایئرگن کے چھرّے تم نے چلائے تھے یا سلیم نے!"

یکلخت اُس کا رنگ لاش کی طرح سفید ہو گیا۔ اُس کی آنکھیں جن میں جوانی کی چمک تھی ایسا رنگ اختیار کر گئیں جیسے کسی ضعیف العمر آدمی کی آنکھیں ہوتی ہیں۔ اس حالت کے بعد ایسا آدمی بے ہوش ہو جایا کرتا ہے۔ مجھ کو معلوم تھا کہ اس کی زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکلے گا۔

"رحمان بھائی!"— میں نے اُس کو بڑے پیار سے کہا— "تم اپنی صفائی میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتے۔ تمہارے اور سلیم کے خلاف شہادت مکمل ہو چکی ہے۔ تم جدھر سے بھی اس الزام سے نکلنے کی کوشش کرو گے اُدھر کوئی نہ کوئی شہادت تمہارے راستے میں کھڑی ہو گی۔ میں تمہیں بچنے کی صورت بتاتا ہوں۔ تم نے اپنے بھائی کے خون کا بدلہ لیا ہے۔ اس وجہ سے میرے دل میں تمہاری ہمدردی پیدا ہو گئی ہے۔ اگر تم خود بیان دے دو گے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ سزائے موت نہیں ہونے دوں گا اور یہ بھی کروں گا کہ مقدمہ ایسا تیار کروں گا کہ تم اپیل میں بری ہو جاؤ گے"۔

اُس کی حالت بگڑتی گئی۔ میں نے پانی منگوا کر اس کو پلایا اور اس کو تیار کرنے لگا کہ وہ بیان دے دے لیکن اس کی نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی

تھیں۔

"تم نے سلیم کو دو خط لکھے ہیں"— میں نے کہا— "دونوں میرے پاس ہیں اور ایک خط تمہیں سلیم نے لکھا ہے جو تمہارے پاس پہنچنے کی بجائے میرے پاس آ گیا ہے"۔

میں نے دونوں لفافے اُس کو دکھائے۔ مجھ کو یہ خطرہ نظر آ رہا تھا کہ یہ شخص بے ہوش ہو جائے گا۔ میں نے اس کو تسلّی دلاسے دینے شروع کر دیئے اور سبز باغ بھی دکھائے۔

"آپ سلیم کو بھی گرفتار کریں گے؟"— اُس نے بڑی ہی کمزور آواز میں پوچھا۔

"کل شام تک وہ بھی یہاں آ جائے گا"— میں نے کہا— "اب سلیم کو بھول جاؤ رحمان! اب اپنے آپ کو بچاؤ اور اپنے آپ کو بچانے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ مجھ کو صحیح بیان دے دو پھر میں تمہاری بچت کا راستہ نکالنے کی کوشش کروں گا"۔

یہ تھانیداروں کا تجربہ ہوتا ہے کہ وہ سمجھ جاتے ہیں کہ ملزم بیان دینے پر آ گیا ہے اور اب یہ صرف جھجک رہا ہے۔ رحمان اُس مقام پر پہنچ گیا تھا۔ آگے یہ میری استادی تھی کہ اس سے پورا بیان لینا ہے۔

مختصر بات یہ ہے کہ وہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ اس نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ شہادت کیا ہے۔ وہ چونکہ مجرم تھا اس واسطے اس کا حوصلہ ختم ہو گیا تھا۔ انسان کا خون ہضم نہیں ہو سکتا۔ ضمیر انسان کے خون کو برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ شخص عادی یا پیشہ ور قاتل تو تھا نہیں' اس نے اُسی میں سکون محسوس کیا کہ بیان دے دے' اور وہ اس نے دے دیا۔

پورا بیان سنانے کی ضرورت نہیں۔ اس نے میرے ساتھ پہلی ملاقات میں

ذکر کیا تھا کہ تقریباً" دو مہینے پہلے اس کے کانوں میں یہ بات پڑی تھی کہ اس کے چھوٹے بھائی بھولے کو بشیر نے سیلاب سے نکالنے کے دھوکے میں ڈبو کر مار دیا تھا۔ اُس نے اُسی روز دل میں عہد کر لیا تھا کہ بھائی کے خون کا بدلہ لے گا۔ اس نے اپنے دوست سلیم کے ساتھ بات کی۔ سلیم نے کہا کہ یہ کام کر دیں گے لیکن ایسے طریقے سے کہ لاش کا اور قاتل کا سراغ نہیں ملے گا۔ رحمان نے سلیم کے ساتھ یہ بات پشاور جا کر کی تھی۔

رحمان اور سلیم کی دوستی بہت گہری تھی۔ رحمان کی زبان میری حوصلہ افزائی سے چل پڑی تو اس نے ہر بات بتانی شروع کر دی۔ اس کی زبانی پتہ لگا کہ سلیم اس کی بہن کے ساتھ شادی کا خواہشمند تھا لیکن رحمان کے والدین رضامند نہیں تھے۔ سلیم نے رحمان کے ساتھ بات تو کسی اچھے اور شریفانہ طریقے سے کی ہو گی لیکن میں مختصر سنا رہا ہوں اس واسطے میں اتنا ہی کہوں گا کہ سلیم نے رحمان کے آگے یہ شرط رکھی کہ وہ اپنی بہن کا رشتہ اس کو دلا دے تو وہ بشیر کو قتل کرنے میں اس کی پوری مدد کرے گا۔

رحمان نے یہ شرط قبول کر لی۔ اس نے اپنے والدین کو یہ تو نہیں کہنا تھا کہ وہ سلیم سے اپنے دشمن کو قتل کرانا چاہتا ہے' اس نے ایک اور طریقہ اختیار کیا جو یہ تھا کہ اپنے والدین کو دھمکیاں دیں کہ وہ اس کے عزیز دوست کو رشتہ نہیں دیں گے تو وہ ان سے تعلق توڑ کر الگ ہو جائے گا۔ والدین اپنے بیٹوں کی اتنی شدید ناراضگی برداشت نہیں کر سکتے۔ انہوں نے سلیم کو رشتہ دے دیا۔ سلیم نے رحمان سے کہا کہ وہ پہلے بشیر کو قتل کرے گا پھر منگنی ہو گی۔

رحمان نے اپنے بیان میں تین چار مرتبہ کہا کہ وہ جب بشیر کو دیکھتا تھا تو اُس پر پاگلوں جیسی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ اس کا دل کرتا تھا کہ بشیر کا گلا

سب کے سامنے گھونٹ دے اور لوگوں کو کہے کہ اس نے میرے بھائی کو قتل کیا تھا۔

ظاہری طور پر بشیر اور رحمان کی کوئی دشمنی نہیں تھی۔ سلیم کے ساتھ بشیر کی بڑی اچھی سلام دعا تھی۔ سلیم دس دن کی چُھٹی لے کر آیا۔ ایک روز اُس نے بشیر کو کہا کہ چلو یار میرا ساتھ دو' میرے پاس ائیرگن ہے' کچھ پرندے مار لاتے ہیں۔ بشیر تیار ہو گیا۔ سلیم عقلمند آدمی تھا۔ انہوں نے اگلے روز شکار کے واسطے جانا تھا۔ سلیم نے رحمان کو بتایا کہ باہر اس طرح نکلیں گے کہ بشیر ان کے ساتھ نہ ہو تاکہ کسی کو پتہ ہی نہ لگے کہ بشیر ان کے ساتھ گیا تھا۔ اُس سکیم کے مطابق سلیم یہ کہہ کر بازار چلا گیا کہ چھرّے کم ہیں' وہ چھرّوں کا ایک پیکٹ لے کر اِدھر سے ہی فلاں جگہ پہنچ جائے گا۔ رحمان نے بھی ایک بہانہ بنا کر ایک اور راستہ اختیار کیا۔

بشیر کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ اُس کے دن پورے ہو چکے تھے۔ اب رحمان اور سلیم نہیں بلکہ موت اس کی رہنمائی کر رہی تھی۔ وہ اکیلا چل پڑا اور قصبے سے دور ایسی جگہ تینوں اکٹھے ہوئے جہاں ان کو دن کے وقت بھی کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ رحمان اور سلیم نے ایک روز پہلے جا کر یہ جگہ دیکھ لی تھی۔ وہ بشیر کے ساتھ ہنسی مذاق کی باتیں کرتے اُس جگہ پہنچ گئے۔ سلیم کہتا تھا کہ اس جگہ خرگوش مل جائیں گے۔

جب وہ اُس جگہ پہنچے تو سلیم پیچھے ہو گیا۔ اُس نے گن میں چھرّہ ڈال لیا تھا۔ اس نے ائیرگن کی نالی بشیر کے سر سے چند انچ پیچھے رکھ کر چلتے چلتے ایک چھرّہ فائر کر دیا۔ بشیر پیچھے کو گھوما اور چکرا کر گر پڑا۔ سلیم نے اس کے ایک کان سے ذرا اوپر گن کی نالی سر کے بالکل ساتھ لگا کر ایک اور چھرّہ فائر کیا۔ زمین

میں دراڑ قریب ہی تھی۔ سلیم اور رحمان نے بشیر کو جو ابھی زندہ اور بیہوش تھا، دھکیل کر دراڑ میں پھینک دیا۔ یہ دراڑ قدرت کی بنائی ہوئی قبر تھی۔ بشیر کا جسم اس میں فٹ آگیا۔

بشیر کے سر سے خون نکل رہا تھا۔ چھرّے کھوپڑی کے اندر چلے گئے تھے۔ رحمان اور سلیم نے دراڑ کے کنارے پاؤں سے توڑ کر مٹی بشیر پر ڈال دی۔ وہاں زمین نرم تھی۔ انہوں نے نوکیلے اور لمبوترے پتھروں سے اِردگرد سے مٹی کھود کر بیہوش بشیر پر ڈالی۔ ابھی بہت سی مٹی کی ضرورت تھی۔ انہوں نے اِدھر اُدھر سے مٹی اور ڈھیلے اٹھا کر دراڑ کو بھر دیا۔

بشیر نے مرہی جانا تھا۔ اس پر مٹی اتنی زیادہ ڈال دی گئی کہ وہ جلدی مر گیا ہو گا۔ وہ دونوں آگے چلے گئے اور چند ایک کبوتر اور فاختائیں مار کر لمبا چکر کاٹا اور کسی اور ہی طرف سے قصبے میں داخل ہوئے۔ اپنے محلّے میں ان کو جو بھی ملا اس کو بتایا کہ وہ فلاں طرف چلے گئے تھے۔ یہ فلاں جگہ بالکل اُلٹی طرف تھی، یعنی وہ گئے مشرق کو اور مشہور کیا کہ مغرب کو گئے تھے۔

اس سے اگلے دن سلیم کی منگنی رحمان کی بہن سے کر دی گئی۔

رحمان کو حوالات میں بند کر کے میں نے اے ایس آئی سے کہا کہ کل اس کا ایک ہفتے کا ریمانڈ لے لے۔ میں اُسی روز پشاور چلا گیا۔ ایئر بیس پر جا کر سلیم کے کمانڈنگ آفیسر سے ملا۔ اُسے حکمنامہ دکھایا۔ وہ ہندو سکواڈرن لیڈر تھا۔ اُس نے ایئر فورس پولیس کو فون کیا۔ ایک آفیسر اور ایک سارجنٹ آگیا۔ پھر کارپورل سلیم کو بلایا گیا۔ اس کو میرے حوالے کر دیا گیا۔

میں نے اس کی بارک میں جا کر ایئر فورس پولیس کے آفیسر اور سارجنٹ کی موجودگی میں اس کے دونوں بکسوں کی تلاشی لی۔ ایک خط برآمد ہُوا جو رحمان نے اس کو لکھا تھا کہ بشیر کی لاش برآمد ہو گئی ہے۔ اس میں دو تین فقرے ذرا

واضح تھے۔ میں نے خط کی برآمدگی کا گواہ سارجنٹ کو بنا لیا۔

میرا خیال ہے کہ یہ تفصیل بتانے کی ضرورت نہیں کہ میں نے کیا کیا شہادت اکٹھی کی۔ آپ بور ہوں گے۔ میں سلیم کو حراست میں لے کر واپس آگیا۔ میرے ساتھ دو کانسٹیبل تھے۔ سلیم کو میں نے ریل گاڑی میں ہی بتا دیا کہ رحمان نے اقبالِ جرم کر لیا ہے۔ سلیم نے بیان دینا شروع کر دیا۔ یہ اس کا اقبالِ جرم تھا۔

تھانے میں آکر ہینڈ رائٹنگ ایکسپرٹ کو ان کے خط دکھا کر ان کے ہینڈ رائٹنگ کے نمونے ان سے لے کر ایکسپرٹ کا سرٹیفکیٹ لیا۔ سلیم کی ایئر گن اور چھرّے برآمد کئے۔ یہ گن دیسی نہیں تھی۔ انگلینڈ کی بنی ہوئی تھی جو اتنا پریشر پیدا کرتی تھی کہ اتنی قریب سے چلایا ہُوا چھرّہ کھوپڑی کے اندر جا سکتا تھا۔

دونوں ملزموں نے مجسٹریٹ کو زیر دفعہ ۱۶۴ بیان دینے کی رضامندی ظاہر کر دی لیکن مجسٹریٹ کے پاس جا کر دونوں نے یہ بیان دیا کہ وہ اقبالی بیان نہیں دینا چاہتے نہ انہوں نے کوئی جرم کیا ہے۔ پولیس نے ان پر تشدّد کر کے بیان دینے پر راضی کیا ہے۔ مجسٹریٹ نے ان کو قانون کے مطابق جیل کی حوالات میں بھیج دیا۔

میں نے بڑی محنت سے شہادت اکٹھی کی اور مقدمہ تیار کیا۔ سیشن کورٹ نے دونوں کو عمر قید دے دی لیکن ہائی کورٹ نے اپیل میں دونوں کو بری کر دیا۔

اس کیس کے چھ سات مہینے بعد مجھ کو اس تھانے سے تبدیل کر کے امرتسر بھیج دیا گیا۔ پھر پاکستان وجود میں آگیا۔ وہاں سے آتے میری ایک ٹانگ کٹ گئی پھر مجھ کو معذوری پنشن پر گھر بھیج دیا گیا۔ تین سال بعد اپنا ایک پرانا دوست مل گیا۔ اس کو میری جگہ اس تھانے میں تعینّات کیا گیا تھا جس کا یہ کیس سنایا

ہے۔ اُس وقت میرا یہ دوست سب انسپکٹر تھا۔ اس نے مجھ کو بڑی عجیب کہانی سنائی۔ یہ اُن ہی لوگوں کی کہانی تھی۔ میں نے اسی وقت جب رحمان اور سلیم بری ہوئے تھے' کہہ دیا تھا کہ خواجہ اپنے بیٹے کے قاتلوں سے انتقام ضرور لے گا۔

میں پاکستانی پنجاب کے ایک قصبے کا رہنے والا تھا۔ امرتسر تبادلہ ہو جانے کی وجہ سے اُدھر پھنس گیا تھا۔ پاکستان اور ہندوستان آزاد ہوئے تو ہندوستان میں مسلمانوں کی نسل ختم کرنے کے واسطے ہندو اور سکھ آزاد ہو گئے۔ انسانی تاریخ کا سب سے بڑا قتلِ عام مشرقی پنجاب میں ہُوا۔ اس کی تفصیلات تو آپ پڑھتے اور سنتے ہی رہتے ہیں۔ میں صرف یہ بتا رہا ہوں کہ میں امرتسر کے ایک ایسے علاقے میں پھنس گیا تھا جو مسلمانوں کے لئے خونی پھندہ بن گیا تھا۔ میں اپنی ایک ٹانگ قربان کر کے وہاں سے ایسے طریقے سے نکلا تھا جو معجزے سے کم نہ تھا۔

یہ ایک الگ اور سنسنی خیز کہانی ہے جو پھر کبھی سناؤں گا۔ میں جب پاکستان پہنچا' اُس وقت ٹانگ میرے ساتھ تھی۔ مجھ کو معلوم تھا کہ پاکستان جا کر یہ ٹانگ میرے جسم کے ساتھ نہیں رہے گی۔ اُس کو کٹ جانا تھا۔ ایسے ہی ہُوا۔ مجھ کو سیدھا میو ہسپتال لے گئے۔ تین مہینوں بعد جب میں میو ہسپتال سے نکلا تو میری ایک ٹانگ اپنی اور دوسری مصنوعی تھی۔ میری ترقی کا بھی وقت آ گیا تھا۔ میرے محکمے اور حکومت پاکستان نے میرے ساتھ یہ مہربانی کی کہ مجھ کو ترقی دے کر انسپکٹر بنا دیا اور اس عہدے کے مطابق معذوری پنشن دے دی۔

پولیس کے جن لوگوں نے میرے ساتھ سروس کی تھی' ان میں سے بعض میرے گھر مجھ کو دیکھنے کے واسطے آئے۔ جنوری 1949ء میں ایک دن میرا ایک عزیز دوست انسپکٹر نادر علی خان مجھ کو دیکھنے میرے ہاں آ گیا۔ وہ راولپنڈی سے آیا

تھا اور صرف ایک دن کے لئے آیا تھا۔ میں نے اس کو تین دن روکے رکھا۔ یقین کریں کہ ہم تین راتیں ایک منٹ بھی نہ سوئے۔ پرانی باتیں یاد کرتے رہے۔

مجھ کو بہت افسوس ہے کہ پاکستان میں آ کر میرے اس دوست کا انجام اچھا نہیں ہُوا۔ انگریزوں کے دورِ حکومت میں تو ہر تھانیدار کو دیانتدار اور اپنی ڈیوٹی کا پکّا رہنا پڑتا تھا' نادر علی خان نے پاکستان میں بھی انگریزوں کے دور والی دیانتداری شروع کر دی۔ اس کا اصول یہ تھا کہ پولیس کا سیاست کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ اس نے اس حقیقت کو قبول ہی نہ کیا کہ ملک کی سیاست اور حکومت جاگیرداروں اور سمگلروں کے ہاتھ آ گئی ہے اور انہوں نے پولیس کو اپنا آلۂ کار بنا لیا ہے۔

وہ 1950ء میں انسپکٹر ہو گیا۔ ایک سال بعد اس سے ایک سیاسی بدپرہیزی ہو گئی تو اس کو سب انسپکٹر بنا دیا گیا۔ ایک سال بعد اس کا عہدہ بحال کر دیا گیا لیکن سروس سے وہ دلبرداشتہ ہو چکا تھا۔ 1953ء کے آخر میں اس نے قومی اسمبلی کے ایک ممبر کو پکڑ لیا۔ یہ ممبر اوپر پہنچنے والا تھا' جس کو پاور والا کہتے ہیں۔ نادر علی خان نے قبل از وقت ریٹائرمنٹ کے لئے درخواست دی جو فوراً منظور کر لی گئی اور اس طرح میرے اس دوست نے بددیانتی قبول کرنے کی بجائے کم پنشن قبول کر لی لیکن اللہ نے اس کو ایسا ذریعۂ معاش عطا کیا کہ آج اس کی دوسری نسل بھی باعزت زندگی گزار رہی ہے۔

انگریزوں کے وقتوں میں مجھ کو یاد ہے' قتل یا ڈکیتی کی واردات ہو جاتی پھر نادر علی کی تفتیش دیکھنے والی ہوتی تھی۔ ملزموں کا سراغ لگانے کے واسطے وہ ایسی ایسی جگہوں پر جا پہنچتا تھا کہ بعض لوگ کہتے تھے کہ یہ شخص دماغی توازن کھو بیٹھا ہے۔

میں نے آپ کو خواجہ صاحب کے بیٹے بشیر کے قتل کی واردات اور تفتیش

سنائی ہے۔ دونوں ملزموں' کارپورل سلیم اور رحمان' کو سیشن کورٹ نے سزائے عمر قید دے دی تھی۔ ملزموں نے ہائیکورٹ میں اپیل دائر کی تھی۔ مجھ کو امرتسر بھیج دیا گیا۔ وہاں مجھ کو پتہ لگ گیا تھا کہ ہائیکورٹ نے دونوں کو بری کر دیا ہے۔

میری جگہ جس تھانیدار کو یہ تھانہ دیا گیا تھا وہ میرا ہی دوست نادر علی خان تھا جو اُس وقت سب انسپکٹر تھا۔ وہ جب جنوری 1949ء میں مجھے ملنے آیا تو جہاں ہم نے اور بہت سی باتیں کیں وہاں اس کیس کا بھی ذکر آ گیا۔

"تم تو یہ کیس ختم کر کے تسلی میں ہو گئے تھے"—— نادر علی نے کہا——
"مجھ کو اس کیس کی اگلی واردات نے بے حال کر دیا تھا۔ جب یہ واردات ہوئی اور اس کے ساتھ ہی ایک اور واردات ہو گئی تو مجھ کو وہ سارا کیس سنایا گیا تھا جس کی تفتیش تم نے کی تھی"۔

نادر علی خان نے یہ واردات اپنے رنگ میں سنائی تھی۔ مجھ کو اس کیس کے ساتھ بہت دلچسپی تھی اس واسطے میں نے نادر علی سے چھوٹی چھوٹی باتیں بھی پوچھی تھیں۔ میں یہ سارا کیس اپنی زبان میں سناؤں گا۔ یہ ذہن میں رکھیں کہ یہ کیس پاکستان بننے کے ڈیڑھ دو سال پہلے کا ہے۔ مطلب یہ کہ ابھی حکومت انگریزوں کی تھی۔

کارپورل سلیم اور رحمان کی اپیل منظور ہو گئی اور ان کو رہا کر دیا گیا۔ سلیم رہا ہوتے ہی پشاور ائیرفورس میں چلا گیا۔ جنگِ عظیم ختم ہو چکی تھی۔ جنگ کے دوران انڈین ائیر فورس میں بہت زیادہ لوگوں کو بھرتی کر لیا گیا تھا۔ جنگ کے بعد یہ نفری فالتو اور غیر ضروری ہو گئی۔ انگریزوں نے ایک قانون بنا دیا جس کے تحت یہ اجازت دے دی گئی کہ جو سروس سے نکلنا چاہتا ہے وہ ریلیز لے سکتا ہے۔ ریلیز کا مطلب یہ تھا کہ کچھ رقم دے کر اس شخص کو سروس سے فارغ کر

دیا جاتا تھا۔

چند مہینوں بعد سلیم انڈین ائیرفورس سے ریلیز ہو کر گھر آ گیا۔ وہ کاروبار یا دکان کرنا چاہتا تھا۔ قصبے کے ساتھ ہی اس کی تھوڑی سی زمین بھی تھی۔ اس کا ارادہ یہ بھی تھا کہ اس زمین میں رہٹ لگوا کر سبزیاں اگائے گا۔ قصبے میں اُن سے اچھی آمدنی ہو سکتی تھی لیکن نہ اسے معلوم تھا نہ اس کے گھر والوں کو کہ اس کی زندگی کے دن پورے ہو چکے ہیں اور اسے موت سروس سے نکال کر لے آئی ہے۔

ایک مہینہ یا ڈیڑھ مہینہ گزرا ہو گا کہ علی الصبح تھانے میں اطلاع کہ سلیم کی لاش برساتی نالے میں پڑی ہوئی ہے۔ نادر علی نے پہلا کام یہ کیا کہ ایک کانسٹیبل کو یہ حکم دے کر جائے وقوعہ کی طرف دوڑا دیا کہ کوئی بندہ لاش کے قریب نہ جائے بلکہ کوئی شخص نالے کے کناروں سے آگے نہ جائے۔

"جناب!"—— اے ایس آئی نے نادر علی خان کو کہا—— "یہ قتل کی واردات ہونی ہی تھی"۔

ہیڈ کانسٹیبلوں نے بھی یہی بات کہی اور تھانے کے ہر آدمی نے کہا کہ لاش کو دیکھے بغیر وہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ شخص قتل ہوُا ہے اور قتل کرنے یا کرانے والا خواجہ صاحب ہے کیونکہ سلیم نے خواجہ صاحب کا اکلوتا جوان بیٹا قتل کیا تھا اور اپیل میں بری ہو کر آ گیا تھا۔

پیشتر اس کے کہ نادر علی اس کیس کی بیک گراؤنڈ سنتا' سلیم کا باپ اپنے دو تین رشتہ داروں اور محلّے کے دو معزّزین کے ساتھ آ گیا۔

"میرا بیٹا قتل ہو گیا ہے"—— سلیم کے باپ نے روتے ہوئے کہا۔

"کسی پر شک؟"—— نادر علی نے پوچھا۔

اُس نے خواجہ صاحب کا نام لیا اور وجہ یہ بتائی کہ سلیم نے اس کے بیٹے کو

قتل کیا تھا۔

"لیکن میرا بیٹا بے گناہ تھا"۔۔۔ اُس نے کہا۔۔۔ "ہائیکورٹ نے اس کو بری کر دیا تھا"۔

"اگر آپ کا بیٹا بے گناہ تھا تو جس پر آپ شک کر رہے ہیں وہ بھی بے گناہ ہو گا"۔۔۔ نادر علی نے کہا۔۔۔ "اپیل میں بری ہونے والے بے گناہ نہیں ہُوا کرتے بلکہ اس واسطے بری کر دیئے جاتے ہیں کہ شہادت اور قانون میں کوئی خلا رہ جاتا ہے جس سے شک پیدا ہوتا ہے اور قانون کے مطابق شک کا فائدہ ملزم کو دیا جاتا ہے.... بہرحال محترم! آپ کو پورا انصاف ملے گا۔ صرف یہ خیال رکھنا کہ مجھ کو گمراہ نہ کرنا۔ ہربات سچ بتانا"۔

کالے جادو کا عمل اور عورت

نادر علی موقعہ کی طرف چل پڑا۔ اُس نے دو تین کانسٹیبلوں اور ایک سینئر ہیڈ کانسٹیبل کو ساتھ لے لیا تھا۔ ان سب کو اس نے الگ کر لیا اور ان سے خواجہ کے بیٹے بشیر کے قتل کی واردات سنتا گیا۔ انہوں نے اس کو یہ ساری واردات اور میری تفتیش سنادی جو میں آپ کو پوری تفصیل سے سنا چکا ہوں۔

نادر علی کے ساتھ خواجہ کی ملاقات تھی۔ خواجہ ہرنئے تھانیدار کے ساتھ تعلقات پیدا کرنا اور پھر وقتاً" فوقتاً" تھانیدار کو سلام کرنے کے لئے تھانے حاضری دینا اور دوسروں کے خلاف چغلیاں کھانے کو اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اُس کا اثر و رسوخ پولیس کے بالائی افسروں میں بھی تھا۔ وہ انگریزوں کا پیدائشی اور خاندانی ملازم تھا۔

میں اس شخص سے تنگ بھی آجایا کرتا تھا۔ کبھی کبھی وہ تھانے میں آکر اس طرح باتیں شروع کر دیتا تھا جیسے وہ علاقہ ڈی ایس پی ہو۔ کوئی معمولی سا انگریز

افسر سامنے آجاتا تو خواجہ اُس کو فرشی سلامؑ کیا کرتا تھا لیکن میں نے دیکھا تھا کہ اس کا بیٹا قتل ہو گیا تو وہ بجھ کے رہ گیا تھا۔ نادر علی نے مجھ کو بتایا کہ اُس نے تھانے آنا بہت ہی کم کر دیا تھا اور کبھی آتا بھی تھا تو غمگین اور رنجیدہ ہی نظر آتا تھا۔

نادر علی اس شخص کو سمجھا نہیں تھا۔ خواجہ زہریلا آدمی تھا۔ امیر کبیر زمیندار تھا اور اُس نے تین غنڈے بھی پالے ہوئے تھے جن سے وہ اپنی مرضی کا کوئی بھی جرم کرا سکتا تھا۔ مختصر یہ کہ وہ پاور والا آدمی تھا۔ قصبے کے سب سے زیادہ دولت مند اور رئیس ہندو اور سکھ تھے۔ یہ سب خواجہ کو ہاتھ جوڑ کر اور ذرا جُھک کر سلام کیا کرتے تھے۔

موقعہ پر گئے۔ نادر علی نے ایک کانسٹیبل کو پہلے ہی بھیج دیا تھا کہ کسی آدمی کو نالے کے اندر نہ جانے دے۔ لوگ کھُرے ضائع کر دیتے ہیں۔ خوش قسمتی سے دو سیانے آدمی کانسٹیبل سے بھی پہلے وہاں پہنچ گئے تھے اور انہوں نے لوگوں کو دُور ہی روکا ہُوا تھا۔

کھوجی تفتیشی پارٹی کا ایک ضروری حصہ ہُوا کرتا تھا۔ ایک کھوجی بھی آگیا تھا۔ یہ وہی برساتی نالہ تھا کہ ساون کی بارش برستی تھی تو اس میں زبردست سیلاب آجاتا تھا۔ لوگ اس کے قریب جانے سے ڈرتے تھے۔ اب وہی نالہ تھا جس میں پانی کی دو لکیریں بہہ رہی تھیں اور پانی بڑی مشکل سے ٹخنوں تک تھا۔ باقی تمام نالہ خشک تھا۔ ریت ہی ریت تھی۔ موسم سردیوں کا تھا۔ تمام سردیاں نالہ خشک رہتا تھا۔

سلیم کی لاش نالے میں اُس جگہ پڑی ہوئی تھی جہاں نالے کے درمیان بہتی ہوئی پانی کی لکیر دو حصوں میں بٹ جاتی تھی۔ یہ پانی دو تین فٹ چوڑا ہو گا۔ آگے یہ دو شاخوں میں بٹ کر ایک شاخ ایک کنارے کے ساتھ ساتھ چلی

گئی تھی اور دوسری دوسرے کنارے کے ساتھ۔

لاش کے قریب پہلے کھوجی گیا۔ وہ پھُونک پھُونک کر قدم رکھتا جا رہا تھا اور وہ رکوع کی پوزیشن میں جھکا ہُوا تھا۔ اس نے لاش کے اردگرد زمین دیکھی۔ وہاں سے وہ زمین کو دیکھتا کنارے تک گیا جہاں سے ذرا ذرا پانی گزر رہا تھا۔ اُدھر والا کنارہ خاصا اونچا تھا۔ مٹی کی دیوار کھڑی تھی۔ اس میں سے گھاٹی اوپر جاتی تھی۔ یہ نالے میں سے گزرنے کا رستہ تھا۔

ایک کھُرا اس طرف گیا تھا۔ کھوجی نے پانی میں سے ایک چیز اٹھائی اور لاش تک واپس آیا۔ یہ ایک زنانہ سلیپر تھا جو اس وقت عورتیں گھروں میں پہنا کرتی تھیں۔ کچھ دیر بعد کھوجی نے نادر علی کو اشارہ کیا کہ وہ اب لاش کے قریب آکر اپنا معائنہ کر سکتا ہے۔

کھوجی نے نادر علی کو اپنی رپورٹ یوں دی کہ مقتول کے ساتھ ایک عورت بھی تھی۔ وہ بڑے آرام سے یہاں چلتی ہوئی آئی تھی لیکن دوڑتی ہوئی واپس گئی۔ وہ اتنی جلدی میں تھی کہ اس کا ایک سلیپر پانی میں رہ گیا۔ وہ یقیناً ڈری ہوئی بھاگی تھی۔ سلیپر کا ایک پاؤں پانی میں چھوڑ کر بھاگ گئی۔

"یہ کالے جادو کا کوئی عمل کر رہا تھا" ـــــ کھوجی نے کہا ـــــ "یہاں پڑی ہوئی چیزیں دیکھیں"۔

نادر علی نے پہلے لاش کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ جسم پر زخم یا چوٹ کا کوئی نشان نہیں تھا۔ اس کا گلا گھونٹا گیا تھا۔ گلا گھونٹنے کے واسطے موٹی رسّی استعمال کی گئی تھی یا رومال جیسا کوئی کپڑا رسّی کی طرح موڑ کر گلے کے گرد لپیٹا گیا تھا۔

یہ تو تھا مارنے کا طریقہ' وہاں اور جو اشیاء دیکھی گئیں ان سے یہ سراغ ملتا تھا کہ مقتول وہاں کیا کر رہا تھا۔ ایک مٹی کا دِیا تھا جس میں سرسوں کا تھوڑا سا

تیل تھا۔ روئی کی بنی ہوئی بتی اس میں پڑی ہوئی تھی۔ یہ دِیئے کی عام بتّی سے زیادہ موٹی تھی۔ نادر علی خان کو نظر آگیا کہ روئی کی بتی میں کاغذ کی ایک بتّی لپٹی ہوئی ہے۔ اس نے کاغذ کی بتّی باہر نکال کر کھولی۔ اُس پر اوٹ پٹانگ الفاظ لکھے ہوئے تھے۔ ٹیڑھے میڑھے خانے اور انسانی شکلیں اس طرح بنی ہوئی تھیں جیسے کسی بچّے نے بنائی ہوں۔ ایک ایک گز لمبے تین چار کالے دھاگے بھی وہاں پڑے ہوئے تھے۔

یہ سمجھنا کوئی مشکل نہیں تھا کہ یہ سب کیا ہے۔ یہ کوئی عمل تھا جو مقتول وہاں کرنے گیا تھا۔ یہ عمل کالے علم کا ہی ہو سکتا تھا۔ اکثر سننے میں آتا تھا کہ ندی یا دریا کا پانی جہاں دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہے وہاں رات کو ایک خاص عمل کیا جاتا ہے اور جو مراد پوری نہ ہونے والی ہو وہ بھی پوری ہو جاتی ہے۔

نادر علی نے یہ چیزیں اپنے قبضے میں لے لیں اور لاش پوسٹ مارٹم کے واسطے بھجوا دی۔ اس کو تفتیش کے واسطے جن افراد کی ضرورت تھی اُن کو وہ اپنے ساتھ تھانے لے گیا۔ ایک کانسٹیبل کو بھیجا کہ وہ خواجہ کو تھانے لے آئے۔

منگنی ٹوٹ گئی

سلیم مقتول کے باپ اور بھائیوں کو اکٹھے بٹھا کر نادر علی نے ان سے پوچھا کہ ان کو کس پر شک ہے۔ یہ سوال وہ پہلے بھی پوچھ چکا تھا۔ اس کو جو جواب پہلے ملا تھا' اب بھی وہی ملا۔ ان سب نے خواجہ پر شک کیا۔

"لیکن وہ وہاں کوئی عمل کرنے گیا تھا" ـــــ نادر علی نے کہا ـــــ "اور اُس کے ساتھ ایک لڑکی تھی۔ لڑکی وہاں سے بھاگ گئی تھی۔ کیا آپ لوگ بتا سکتے ہیں یہ لڑکی کون تھی؟"

ان میں سے کوئی بھی اس سوال کا جواب نہ دے سکا۔

''آپ لوگوں کو شاید یہ معلوم ہو گا'' ــــ نادر علی نے کہا ــــ ''کہ کالا جادو اُلٹ بھی پڑ جایا کرتا ہے .... یہ میں فیصلہ نہیں دے رہا۔ آپ کی طرح میں بھی سُنی سنائی بات کر رہا ہوں۔ میں دن رات محنت کر کے تفتیش کروں گا اور کسی استاد سے معلوم کروں گا کہ اس طرح کا عمل کرتے ہوئے آدمی مارا بھی جا سکتا ہے؟ آپ لوگ صرف یہ معلوم کریں کہ یہ لڑکی کون تھی؟ کیا وہ کسی خاص لڑکی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا؟ کیا اس کی ابھی شادی ہوئی تھی یا نہیں؟''

میں نے آپ کو اپنی تفتیش کی کہانی میں سنایا تھا کہ خواجہ کے بیٹے بشیر کو قتل کرنے کے اگلے روز سلیم کی منگنی رحمان کی بہن کے ساتھ کر دی گئی تھی۔ دونوں اپیل میں بری ہو کر آ گئے تو سلیم کی شادی اس لڑکی کے ساتھ ہو جانی چاہیے تھی لیکن نادر علی خان نے مجھ کو یہ عجیب بات سنائی کہ منگنی توڑ دی گئی تھی۔ اس کو سلیم مقتول کے باپ وغیرہ نے یہ بات اس کے اس سوال کے جواب میں بتائی تھی کہ مقتول کی شادی ہو گئی تھی یا نہیں یا کیا وہ کسی خاص لڑکی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا؟

''اس کی منگنی ہو گئی تھی'' ــــ نادر علی کو مقتول کے لواحقین کی طرف سے جواب ملا ــــ ''اس کو اور اس کی منگیتر کے بھائی رحمان کو عمر قید کی سزا ہو گئی تو لڑکی والوں نے پیغام بھیجا کہ منگنی ختم ہے۔ سلیم اور رحمان اپیل میں بری ہو کر آ گئے تو ہم رحمان کے گھر مبارک دینے کے واسطے گئے اور ان کو کہا اب لڑکے آ گئے ہیں' اپنی بیٹی کی منگنی ہمارے بیٹے کے ساتھ پھر کر دیں اور شادی کا دن بھی مقرر کریں۔ انہوں نے صاف جواب دے کر کہا کہ ہم قاتل کو بیٹی نہیں دیں گے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ تمہارے بیٹے نے ہمارے بیٹے کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ ہماری بہت بدنامی ہو چکی ہے .... پھر سلیم ریلیز لے

کر گھر آ گیا''۔

''کیا اس نے ایسی ضد کی تھی کہ وہ اسی لڑکی سے شادی کرے گا؟'' ــــ نادر علی نے پوچھا۔

''اس کی خواہش یہی تھی'' ــــ نادر علی کو جواب ملا ــــ ''اس نے ضد نہیں کی تھی''۔

نادر علی نے اس سے پوچھا کہ خواجہ کی طرف سے انہیں کبھی دھمکی ملی ہو یا کہیں سے کوئی اشارہ ملا ہو کہ وہ اپنے بیٹے کے خون کا انتقام لے گا' یا کسی نے انہیں یہ کہا ہو کہ خواجہ سے بچ کر رہنا۔

ان سب نے کہا کہ انہیں ایسا کوئی اشارہ نہیں ملا تھا نہ ہی ان کو کبھی دھمکی ملی تھی۔

''خواجہ کے علاوہ آپ لوگوں کے ساتھ کسی کی دشمنی ہے؟''

''نہیں!'' ــــ نادر علی کو جواب ملا ــــ ''ہمارا کسی کے ساتھ کوئی جھگڑا نہیں''۔

''میری اس بات پر غور کرو'' ــــ نادر علی نے ان کو کہا ــــ ''سلیم کے تعلقات کسی لڑکی کے ساتھ تھے اور قتل کے وقت وہ لڑکی اس کے ساتھ تھی۔ یہ معلوم کرو کہ وہ لڑکی کون تھی۔ مجھ کو یہ بتانے کی کوشش نہ کرنا کہ سلیم پکّا شریف آدمی تھا۔ اس کے دوستوں سے پوچھو۔ اس کا کوئی راز دار دوست ہو تو مجھ کو بتاؤ وہ کون ہے۔ میں اُس سے پوچھوں گا''۔

انہوں نے بتایا کہ مقتول کا راز دار دوست رحمان ہی تھا جو اس کی منگیتر کا بھائی تھا۔

مقتول کے لواحقین سے سراغ والی کوئی بات معلوم نہ ہو سکی۔ انہیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ مقتول رات کس وقت گھر سے نکل گیا تھا۔ نادر علی نے ان

لوگوں کو فارغ کر دیا۔ وہ چلے گئے تو اے ایس آئی اور ہیڈ کانسٹیبل نادر علی کے پاس جا بیٹھے اور اسے بتایا کہ مقتول اور رحمان نے خواجہ کے بیٹے کے قتل کا اقبالی بیان دیا تھا۔ دونوں نے کہا تھا کہ رحمان نے اس شرط پر مقتول کو خواجہ کے بیٹے کے قتل کے واسطے تیار کیا تھا کہ وہ اپنی بہن کی شادی مقتول کے ساتھ کرا دے گا۔ مقتول رحمان کی بہن کے ساتھ شادی کرنے کا خواہش مند تھا۔

خواجہ تھانے میں آیا ہُوا تھا۔ نادر علی کو اُس کی سوشل حیثیت کا علم تھا۔ اس کے ساتھ ہی اسے اپنے فرائض کا بھی احساس تھا۔ اس نے خواجہ کو اپنے پاس بلایا اور بڑے احترام سے اس کا استقبال کیا۔

"خواجہ صاحب!" — نادر علی نے کہا — "میں آپ سے شرمندہ ہوں لیکن اپنی ڈیوٹی کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ آج آپ کو کسی اور حیثیت میں بلایا ہے"۔

"شرمندہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں خان صاحب!" — خواجہ نے کہا — "میں اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ مجھ کو مُشتبہ کی حیثیت سے بلایا گیا ہے۔ اپنی ڈیوٹی کا خیال رکھیں۔ میں تو آپ کے بلاوے کا انتظار کر رہا تھا۔ آپ کے مقتول نے میرے بیٹے کو قتل کیا تھا اور وہ بری ہو کر آگیا تھا۔ قدرتی طور پر پہلا شک مجھ پر ہی ہونا چاہیئے"۔

"پھر اپنے خلاف یہ شک آپ کس طرح رفع کر سکتے ہیں؟" — نادر علی نے پوچھا۔

"یہ آپ کا کام ہے" — خواجہ نے کہا — "میں اگر اپنے سر پر قرآن رکھ کر کہوں کہ میرے خلاف اس شک کی کوئی بنیاد نہیں اور قتل کی اس واردات کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں تو بھی یہ نہیں مانیں گے۔ مجھ کو قسم کھانے کی ضرورت نہیں۔ میں آپ کو مشورہ دیتا ہوں کہ میرے ساتھ وقت ضائع نہ

کریں۔ قاتل کو پکڑنے کی کوشش کریں۔ میں نے اپنے بیٹے کے قاتل کو قتل کرنا ہوتا تو اس طرح بزدلوں کی طرح اس کے گلے میں پھندا نہ ڈالتا۔ میرے پاس دو نالی بندوق ہے۔ خدا نے مجھ کو اتنی پاور دی ہے کہ میں قتل کروا سکتا ہوں.... میں نے اس کو قتل کروانا ہوتا تو کلہاڑیوں سے کرواتا اور کہتا کہ اس کے جسم کے ٹکڑے کاٹ کر کھڈ نالوں میں بکھیر دو لیکن خان صاحب! میں ابھی سوچ رہا تھا کہ خدا نے ہی اس سے انتقام لے لیا ہے"۔

"خواجہ صاحب!" — نادر علی نے کہا — "مجھ کو بالکل پسند نہیں کہ آپ کو میں ان چھوٹے چھوٹے لوگوں کی قطار میں کھڑا کر دوں۔ یہ میرا جذبہ ہے۔ انگریزوں کو آپ جانتے ہیں کہ قانون کے معاملے میں وہ چھوٹے بڑے کی تمیز نہیں کیا کرتے۔ یہ قتل کا کیس ہے۔ کسی بھی وقت ڈی ایس پی اچانک آن دھمکے گا اور اس کیس کی فائل نکلوا کر مجھ کو اُلٹا لٹکا دے گا"۔

"آپ بتائیں خان صاحب!" — خواجہ نے کہا — "میرے واسطے جو حکم ہے میں اس کی تعمیل کروں گا"۔

"حکم نہیں خواجہ صاحب!" — نادر علی نے کہا — "اسے میری درخواست سمجھیں۔ اگر آپ کا اس واردات میں ذرا سا بھی ہاتھ ہے تو مجھ کو بتا دیں۔ میں پردہ ڈالنے کی کوشش کروں گا"۔

"نہیں خان صاحب!" — خواجہ نے کہا — "مجھ کو تھانے میں پابند رکھیں اور تفتیش کریں۔ میں آپ کو پھر وہی بات کہوں گا جو پہلے کہہ چکا ہوں کہ میرے دل میں انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی لیکن میں نے ابھی فیصلہ نہیں کیا تھا کہ میں کیا کروں۔ خدا نے مجھ کو بچا لیا ہے اور خود ہی انتقام لے لیا ہے"۔

من پسند شادی کا مسئلہ

نادر علی خان نے خواجہ کے ساتھ یہی دو تین باتیں نہیں کی تھیں۔ اس نے خواجہ کے ساتھ بہت وقت لگایا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ خواجہ بے حد چالاک اور گہرا آدمی ہے' اور نادر علی کو یہ توقع تو تھی ہی نہیں کہ خواجہ مان لے گا کہ قتل کی یہ واردات اس نے کروائی ہے۔ یہ قتل اس نے خود نہیں کیا بلکہ کروایا ہو گا۔

نادر علی نے اس وقت بہتر یہ سمجھا کہ خواجہ کو یہ تاثر دے کر جانے دے کہ اس پر شک نہیں رہا۔ چنانچہ اس نے خواجہ کے ساتھ ایسے انداز میں باتیں کیں جیسے وہ خواجہ سے مرعوب ہو۔ نادر علی کو یہ بھی معلوم تھا کہ خواجہ نے تین جرائم پیشہ آدمی رکھے ہوئے ہیں۔ اس کو ان تینوں کے نام اور ان کی ہسٹری بھی بتا دی گئی تھی۔ نادر علی کا اپنا طریقہ تفتیش تھا۔ اس نے ان آدمیوں کی بابت خواجہ کے ساتھ بات نہیں کی تھی بلکہ یہ ظاہر ہی نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ ان کو جانتا ہے۔

اس نے ان کی نگرانی کا یہ اہتمام کیا کہ ان ہی جیسے دو جرائم پیشہ نوجوان لڑکے ان کے ساتھ لگا دیئے۔ یہ دونوں عقل والے لڑکے تھے۔ ان کو اس نے تھانے بلا کر ضروری ہدایات دیں اور کہا کہ ان کے اس طرح دوست بن جائیں جیسے ان کے شاگرد بننا چاہتے ہوں۔

پوسٹمارٹم قصبے کے سول ہسپتال میں ہُوا کرتا تھا۔ ایک منٹ بھی ضائع نہیں کیا جاتا تھا۔ شام تک پوسٹمارٹم رپورٹ آگئی۔ موت رسّی یا کپڑے سے گلا گھونٹنے سے واقع ہوئی تھی۔ مقتول رات بارہ بجے کے چند منٹ بعد مرا تھا۔

اُس رات نادر علی نے تفتیش آگے نہ بڑھائی لیکن اُس کے دماغ میں یہی

واردات موجود رہی اور اس کا سراغرساں دماغ سراغرسانی میں مصروف رہا۔ اس میں کوئی شُبہ نہیں رہ گیا تھا کہ مقتول وہاں کوئی پُراسرار عمل کر رہا تھا۔ نادر علی عام لوگوں کی طرح مانتا تھا کہ کالے علم کے دوران یہ عمل اُلٹ بھی پڑ سکتا ہے' اور یہ عموماً" اس صورت میں ہوتا ہے کہ عمل کرنے والے سے کوئی غلط حرکت سرزد ہو گئی ہو یا اس عمل کی کوئی شرط پوری نہ کی گئی ہو۔

نادر علی یہ بھی مانتا تھا کہ عمل اگر نوری اور روحانی ہو یا کوئی وظیفہ ہی ہو' اگر کوئی بدپرہیزی ہو جائے تو اس کا اثر اُلٹا ہو جاتا ہے جو عامل کی جان بھی لے سکتا ہے۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ اس کا یہ عقیدہ یا نظریہ صحیح تھا یا نہیں۔ میں آپ کو اس کی سوچ بتا رہا ہوں کیا تھی۔ اس نے مجھ کو اپنی تفتیش سناتے ہوئے کہا تھا کہ اس قسم کے عملیات میں مؤکل استعمال ہوتے ہیں۔ وہ مؤکل کو جن کہتا تھا۔

"بعض مؤکل بڑے سخت ہوتے ہیں" ـــــ اس نے کہا ـــــ "وہ بگڑ جائیں تو جان لے کر چھوڑتے ہیں۔ عامل اگر عمل خود کرے تو وہ مؤکل کو قابو میں رکھتا ہے۔ اگر عامل اپنے سائل سے عمل کروائے تو سائل کے واسطے خطرہ پیدا ہو جاتا ہے"۔

میں نے پہلے بتایا ہے کہ نادر علی تفتیش کے معاملے میں خبطی اور جنونی تھا۔ اُس نے سوچا کہ اِدھر اُدھر کے مُشتبے اکٹھے کر کے ان پر وقت ضائع کرنے کی بجائے پہلے یہ دیکھ لیا جائے کہ یہ واردات مؤکلوں کی ہی نہ ہو۔ یہ بھی اس کو معلوم تھا کہ عملیات کے کسی ماہر نے اس کو یقین دلایا کہ یہ قتل نہیں بلکہ یہ کسی عمل کا اُلٹا اثر ہے تو انگریز افسر تسلیم نہیں کریں گے۔ اس کے باوجود وہ سوچ رہا تھا کہ کس سے راہنمائی حاصل کرے۔

مختلف عملیات کے ایک عالم بزرگ بار بار اس کے ذہن میں آتے تھے لیکن وہ پچیس میل دُور رہتے تھے۔ نادر علی اس علاقے کا ایس ایچ او رہ چکا تھا اور عالم کے ساتھ اس کی بڑی اچھی سلام دعا تھی۔ وہ عالم تھے عامل نہیں تھے۔ نادر علی کے سامنے مشکل یہ تھی کہ آسانی سے اور صرف اپنی مرضی سے تھانے سے اتنی دور نہیں جا سکتا تھا۔ اس کو چُھٹی ملنے کی بھی توقع نہیں تھی۔ نئے تھانے میں آنے سے پہلے وہ دس دنوں کی چُھٹی لے چکا تھا۔ تفتیش کے واسطے اس بزرگ کے پاس جانے کی اس کو اجازت نہیں مل سکتی تھی۔

اس نے ایک خطرہ مول لے لیا۔ اپنے دونوں ماتحت اسسٹنٹ سب انسپکٹروں کو اعتماد میں لے کر اس نے کاغذوں میں ایک اور جگہ بسلسلہ تفتیش لکھی اور بذریعہ بس عالم کے قصبے کو روانہ ہو گیا۔ وردی کی بجائے وہ پرائیویٹ کپڑوں میں گیا تھا۔ جنگِ عظیم کا یہ فائدہ ہُوا کہ ٹرانسپورٹ کا مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ جنگ ختم ہو چکی تھی۔ نادر علی بڑی آسانی سے شام سے بہت پہلے واپس آسکتا تھا۔

وہ علی الصبح پہلی بس سے نکل گیا تھا۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ عالم کے گھر میں بیٹھا ہُوا تھا۔ وہ جائے وقوعہ سے ملنے والی اشیاء ساتھ لے گیا تھا۔ ایک دِیا تھا۔ اس میں بتّی تھی۔ کالے دھاگے وغیرہ۔ یہ عالم بزرگ کے آگے رکھ کر اس کو واردات اور واردات کی بیک گراؤنڈ سنائی پھر پوچھا کہ یہ موت کیا اس عمل کے الٹ پڑ جانے کا نتیجہ ہو سکتی ہے؟

"نہیں!" — عالم نے ان اشیاء کو ماہرانہ نظروں سے دیکھ کر کہا — "یہ کالا عمل ہے اور اس میں مؤکل استعمال نہیں ہُوا کرتے۔ یہ ایک عام عمل ہے جو یہ شخص کر رہا تھا۔ کالے جادو کے بعض عمل اتنے خطرناک ہوتے ہیں کہ اپنی حفاظت کا انتظام نہ کیا جائے تو عمل کرنے والے کو بہت بڑا نقصان پہنچاتے ہیں۔

... یہ عمل جو یہ شخص کر رہا تھا، کسی خاص مراد کے لئے تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ اپنی پسند کی لڑکی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا"۔

"جائے وقوعہ پر ایک لڑکی کی موجودگی کی شہادت پائی گئی ہے" — نادر علی نے کہا۔

"پھر یہ من پسند شادی کا مسئلہ تھا" — عالم نے کہا — "بہرحال میں آپ کو یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ مرنے والے کو قتل کیا گیا ہے" — عالم نے نادر علی سے پوچھا — "آپ آج کل کہاں ہوتے ہیں؟"

نادر علی نے اپنے تھانے والا قصبہ بتایا۔ اس قصبے کا نام سنتے ہی عالم چونک پڑا اور کسی سوچ میں پڑ گیا۔

"مجھ کو ایک آدمی پر شک ہے" — عالم نے کہا — "آپ کے علاقے میں ایک عامل ہے جو ابھی بالکل اناڑی ہے۔ کچھ عرصہ میرے ساتھ رہا تھا۔ وہ یہ علم سیکھنا چاہتا تھا۔ کچھ حد تک وہ سیکھ بھی گیا تھا۔ میں اس کو کسی استاد کے سپرد کرنا چاہتا تھا لیکن یہ شخص نیّت کا صاف نہیں تھا اس واسطے میرا ساتھ بھی چھوڑ گیا۔ اس سے میرا کوئی نقصان نہیں ہُوا۔ یہ میرا پیشہ تو ہے نہیں۔ کچھ عرصہ بعد مجھ کو اطلاع ملی کہ اس شخص نے باقاعدہ نوسربازی شروع کر دی ہے۔ مجھے معلوم ہُوا تھا کہ وہ آپ کے تھانے کے علاقے میں ہے۔ مجھ کو شک ہے کہ یہ عمل اس کا بتایا ہُوا ہے۔ اس کے بارے میں میں آپ کو یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ نوسربازی کر رہا ہے اور پکّا جرائم پیشہ ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے اپنے جیسے دو تین جرائم پیشہ آدمی اپنے ساتھ رکھے ہوئے ہوں۔ اس کا اصلی نام فتح محمد ہے اور فتح شاہ کہلاتا ہے۔ آپ ذرا اس سے معلوم کر لیں۔ میں آپ کو ایک بار پھر بتاتا ہوں کہ آپ کے مقتول کی

موت کا سبب قتل کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس پر کوئی اُلٹا سیدھا اثر نہیں ہوا؟"۔

نادر علی خان وہاں سے واپس آگیا۔

ایک شاہ جی' ایک پیر جی

نادر علی جب واپس اپنے تھانے میں پہنچا تو شام ہونے والی تھی۔ اس نے اپنے عملے کے آدمیوں سے پوچھا کہ یہاں فتح شاہ نام کا کوئی عامل اگر ہے تو وہ کہاں رہتا ہے۔ تین چار کانسٹیبل فتح شاہ کو جانتے تھے۔ انھوں نے نادر علی کو اس کا گھر بتا دیا۔ وہ برساتی نالے کے پار رہتا تھا۔ نادر علی نے ان سے پوچھا کہ اس شخص کے ہاتھ میں کوئی بڑی طاقت ہے یا وہ فریب کاری کر رہا ہے۔

اس کو جو جواب ملے وہ دو طرح کے تھے۔ کسی نے کہا کہ اس کے ہاتھ میں بڑی طاقت ہے اور دوسرے نے کہا کہ وہ فریب کار لگتا ہے۔

نادر علی بہت ہی محنتی افسر تھا۔ اس نے یہ سوچا کہ وہ خود فتح شاہ کے پاس چلا جائے۔ اس نے ایک ہیڈ کانسٹیبل کو ساتھ لیا اور اسی وقت فتح شاہ کے گھر جا پہنچا۔ فتح شاہ کچے سے مکان میں رہتا تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے اس کو آواز دی اور دروازہ بھی کھٹکھٹایا۔

بارہ تیرہ سال عمر کا ایک لڑکا باہر آیا۔ اُس کے چہرے پر گتّے کا ماسک چڑھا ہُوا تھا۔ آپ اس ماسک کو جانتے ہوں گے۔ پتلے سے گتّے پر بڑا خوفناک چہرہ رنگوں میں بنا ہُوا ہوتا ہے۔ بعض چہروں پر سینگ بھی بنائے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس کے دونوں طرف دھاگہ یا الاسٹک بندھا ہُوا ہوتا ہے۔ بچے یہ ماسک اپنے چہروں پر چڑھا کر ایک دوسرے کو ڈراتے ہیں۔

لڑکا باوردی ہیڈ کانسٹیبل کو دیکھتے ہی اندر کو بھاگ گیا۔ نادر علی وردی میں

نہیں تھا۔ لڑکے کے جانے کے فوراً بعد فتح شاہ باہر آیا اور غلاموں کی طرح جُھک کر سلام کیا۔

"یہ ہمارے تھانیدار صاحب ہیں"— ہیڈ کانسٹیبل نے نادر علی کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"مجھ کو معلوم ہے جی!"— فتح شاہ نے کہا— "ان کو کون نہیں جانتا.... حکم کریں' یہ غلام آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہے!"

"ایک عرض لے کر آئے ہیں شاہ جی!"— نادر علی نے ایسے لہجے میں کہا جیسے وہ مصیبت کا مارا ہُوا بہت ہی چھوٹا سا آدمی ہو— "ہم تھوڑی دیر آپ کے پاس بیٹھیں گے"۔

فتح شاہ "بسم اللہ بسم اللہ" کہتا ہُوا ان کو اندر لے گیا اور ایک کمرے میں بٹھایا۔ بیٹھنے کا انتظام فرش پر ہی تھا۔ فتح شاہ نے دو تین تکئے نادر علی کے پیچھے اور دائیں بائیں رکھ دئے۔ نادر علی نے وہ تمام اشیاء جو جائے واردات سے برآمد ہوئی تھیں' فتح شاہ کے آگے رکھ دیں۔

"شاہ جی!"— نادر علی نے کہا— "یہ دیکھیں اور بتائیں یہ سب کیا ہے"۔

فتح شاہ نے ہر چیز کو بڑے غور سے دیکھا۔ کاغذ کی بتّی کھول کر اس پر جو لکھا تھا وہ پڑھا اور پھر نظریں نادر علی کے چہرے پر گاڑ دیں۔

"بڑی خطرناک چیزیں ہیں جناب!"— اس نے کہا— "معلوم نہیں یہ آپ کو کہاں سے ملی ہیں۔ ان کو بہتے پانی میں پھینک دیں۔ یہ جس گھر میں گئیں وہاں تباہی آئے گی"۔

"کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ کیسا عمل ہے اور یہ کس نے تیار کیا ہے؟"— نادر علی نے پوچھا۔

"نہیں حضور!" — فتح شاہ نے جواب دیا — "یہ عمل کئی کاموں کے واسطے کیا جاتا ہے۔ اگر اس عمل میں گڑ بڑ ہو جائے تو عمل کرنے والے کی جان بھی خطرے میں آجاتی ہے"۔

"کیا آپ نے کبھی یہ عمل کیا ہے؟"

"نہیں حضور!" — فتح شاہ نے جواب دیا — "میں نے ایسا خطرناک کام کبھی نہیں کیا' اور سچّی بات یہ ہے کہ مجھ کو یہ عمل کرنا آتا ہی نہیں"۔

"آپ کو یہ تو معلوم ہو گا کہ اس برساتی نالے سے ایک آدمی کی لاش برآمد ہوئی ہے" — نادر علی نے کہا۔

"ہاں سرکار!" — فتح شاہ نے کہا — "میں نے لاش کو تھوڑی دُور سے دیکھا تھا۔ اس وقت آپ وہاں موجود تھے۔ مجھ کو کسی نے بتایا ہے کہ وہاں سے کچھ ایسی چیزیں برآمد ہوئی ہیں جن سے پتہ لگتا ہے کہ یہ شخص وہاں کوئی عمل کر رہا تھا۔ اب آپ نے یہ چیزیں دکھا دی ہیں تو میں کہتا ہوں کہ اس شخص کی جان اس عمل نے ہی لی ہے۔ یہ شخص صحیح طریقے سے عمل نہیں کر سکا"۔

"ایک بات ہے شاہ جی!" — نادر علی نے کہا — "ایک بزرگ کہتے ہیں کہ ان چیزوں میں کوئی خطرہ نہیں اور یہ عمل بھی نہایت معمولی ہے"۔

"وہ بزرگ کون ہیں حضور!"

"وہ آپ کے استاد ہیں" — نادر علی نے عالم کا نام بھی بتا کر کہا — "ہم ان سے مل آئے ہیں"۔

"ہاں جی!" — فتح شاہ نے کہا — "وہ واقعی میرے استاد ہیں لیکن ان کے پاس صرف علم ہے' عمل نہیں۔ عمل تجربے سے حاصل ہوتا ہے اور اصل بات عمل ہے۔ مثلاً" عالم ایک عمل کو بڑا ہی طاقتور کہتا ہے لیکن جن کو اس عمل کا تجربہ ہوتا ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ تو نہایت معمولی عمل ہے"۔

"کیا مقتول آپ کے پاس بھی کبھی آیا تھا؟" — نادر علی نے پوچھا۔

"نہیں حضور!" — فتح شاہ نے جواب دیا — "میں نے اس کی تو کبھی صورت بھی نہیں دیکھی تھی۔ میں کسی کسی کا کام کرتا ہوں۔ بعض لوگ اُلٹے کام کرانے آجاتے ہیں۔ ایک دوسرے کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔ میں اللہ کرنے والا آدمی ہوں حضور! جس کسی کا بھلا ہو رہا ہو' میں اس کی پوری مدد کرتا ہوں"۔

"کیا آپ کالا جادو جانتے ہیں؟"

"ہاں حضور!" — فتح شاہ نے جواب دیا — "جانتا ہوں لیکن کرتا نہیں۔ یہ لعنتی علم ہے"۔

فتح شاہ کے بولنے کا انداز ایسا پُراثر تھا کہ نادر علی اس سے متاثر ہو گیا۔

"شاہ جی!" — نادر علی نے کہا — "ایک کام تو کریں میرا!"

"حکم سرکار!"

"کیا آپ یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ موقعۂ واردات پر لڑکی کون تھی؟"

"میں وعدہ نہیں کرتا حضور!" — فتح شاہ نے جواب دیا — "کوشش کروں گا۔ ناکامی ہوئی تو کسی استاد کی مدد لوں گا۔ مجھ کو کچھ وقت دیں .... چار پانچ دنوں کی مہلت دے دیں .... اور حضور!" — اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا — "میں خود تھانے حاضر ہو جاؤں گا۔ آپ کو جس وقت میری ضرورت پڑے مجھ کو بلا لیں"۔

نادر علی وہاں سے اچھا تاثر لے کر نکلا۔ اُسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے فتح شاہ اس کا ہر مسئلہ حل کر دے گا۔ تھانے میں آیا تو رات کے نو بج رہے تھے۔ وہ فتح شاہ سے متاثر تو ہو گیا تھا لیکن اس بات پر آکر اس کا دماغ بھٹک جاتا تھا کہ مقتول قتل ہُوا ہے یا یہ اس عمل کا اُلٹا اثر ہے جو وہ کر رہا تھا۔

موقعۂ واردات پر جس لڑکی کے کھُرے اور سلیپر ملا تھا' اس کی بابت نادر علی کا ذہن بھٹک گیا تھا۔ اب اس کے ذہن میں کچھ اور ہی سوچیں آنے لگیں۔ ایک یہ کہ یہ شخص اپنا عمل کر رہا تھا۔ قریب سے کوئی راہزن یا ڈاکو گزرے۔ چاندنی رات تھی۔ انہوں نے دیکھا کہ یہ بڑی حسین لڑکی ہے تو اسے پکڑ کر لے گئے۔ مقتول نے ان کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی ہو گی اور اس کوشش میں مارا گیا۔

ایک صورت یہ بھی ممکن تھی کہ اس کے ساتھ جو لڑکی تھی وہ اس کی اپنی بہن تو نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لڑکی کے وارث پہنچ گئے ہوں گے۔ لڑکی بھاگ اٹھی۔ اس کے وارثوں نے مقتول کو قتل کر دیا۔ یہ بتانا ممکن نہیں تھا کہ لڑکی کس انجام کو پہنچی۔

نادر علی نے مخبروں وغیرہ کو بلا کر ضروری ہدایات دیں - وہ اب یہ سراغ لینے کی کوشش میں تھا کہ کسی لڑکی کو اس کے وارثوں نے گھر مارا پیٹا ہو گا اور ہو سکتا تھا کہ اس کو بھی قتل کر دیا گیا ہو۔

وہ رات بھی خاصی گزر گئی۔ نادر علی گھر چلا گیا۔ اگلے روز کے واسطے اس کا پروگرام یہ تھا کہ مقتول کے دوستوں کو بلائے گا۔

اگلے روز وہ تھانے گیا۔ مقتول کا باپ اور غالباً" چچا آ گئے۔ وہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ قاتل کا کوئی سراغ ملا یا نہیں۔ نادر علی نے ان سے پوچھا کہ مقتول کے بہت ہی گہرے دوست کون کون ہیں اور ان کے ایڈریس وغیرہ کیا ہیں۔ انہوں نے تین نام لکھوائے تھے۔ نادر علی نے مقتول کے ان بزرگوں کو رخصت کر دیا۔ تھانے کے کچھ ضروری کام نپٹائے۔ وہ مقتول کے دوستوں کو بلانے کا ارادہ کر رہا تھا کہ ایک بڑی ہی معزز شخصیت آ گئی۔

یہ معزز شخص ایک پیر تھا جو قصبے سے بمشکل ایک میل دُور چھوٹے سے

ایک گاؤں کا رہنے والا تھا۔ یہ کوئی بہت مشہور پیر نہیں تھا' پھر بھی اس کی مریدی کا دائرہ خاصا وسیع تھا۔ اس کی عمر پینتیس سال کے لگ بھگ ہو گی۔ دراز قد آدمی تھا۔ جسم اور چہرہ بھرے ہوئے تھے۔ چہرے پر پیری اور نہایت اچھی صحت کا جلال تھا۔ تراشی ہوئی داڑھی کا اپنا رعب اور تقدس تھا۔ اس نے سبز رنگ کا چُغہ پہنا ہُوا تھا اور اس کے ہاتھ میں بید کی پالش کی ہوئی ڈنڈہ نما چھڑی تھی۔

میں اس پیر کو کچھ زیادہ ہی اچھی طرح جانتا تھا۔ یہ ایک روائتی پیر تھا لیکن اصل بدمعاش اور بدکردار آدمی تھا۔ ہر پیر کی طرح اس نے بھی چند ایک نامی گرامی بدمعاشوں کو اپنے خاص مرید بنایا ہُوا تھا۔ ایک بار یہ میرے اڈے چڑھ گیا تھا۔ وہ ایک لگ داستان ہے۔ میں نے تھانے بلا کر اس کی بہت بے عزتی کی تھی۔ میں جب اس تھانے سے تبادلے کے وقت نادر علی کو چارج دے رہا تھا تو اس شخص کی بابت میں نے اس کو خاص طور پر بتایا تھا۔

نادر علی تفتیش کے سلسلے میں اور علاقے میں امن و امان قائم رکھنے کے معاملے میں بہت ہی سخت تھانیدار تھا۔ اس نے اس پیر کو ایسی سخت باتیں کہہ دی تھیں جو میں کہنے کی جراُت نہیں کرتا تھا۔ نادر علی جب مجھ کو یہ واردات سنا رہا تھا تو اس نے بتایا کہ اس پیر کو اس نے ایسا دبا کر رکھا ہُوا تھا کہ کبھی خود ہی سلام کرنے کی نیّت سے تھانے میں آجایا کرتا تھا۔

غور کریں کہ جو پیر تھانیداروں کے سلام کے واسطے چلا جایا کرتا تھا' اس کے آگے لوگ سجدے کیا کرتے تھے۔ اس سے لوگوں کی مجبوری سمجھیں' حماقت سمجھیں یا اسے اس پیر کی فریب کاری کا کمال سمجھیں۔ اب ذرا دیکھیں کہ یہ پیر تھانے کیوں آیا تھا۔ اس کو دیکھ کر کئی کانسٹیبل اس کے استقبال کے واسطے دوڑے لیکن وہ تیز تیز چلتا نادر علی کے دفتر میں چلا گیا۔ نادر علی اس کے

احترام میں اٹھا بھی نہیں۔ پیر نے نادر علی کے ساتھ اس طرح جُھک کر ہاتھ ملایا جیسے نادر علی پیرو مرشد ہو۔ اُس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ پیر کرسی پر بیٹھ گیا۔

پیر اور پُراسرار لڑکی

"آج کیسے کرم کیا سرکار!"— نادر علی نے بڑے شگفتہ لہجے میں کہا۔

"ایک ضروری بات ہے"— پیر نے کہا— "کوئی اور اندر نہ آئے"۔

نادر علی نے ایک کانسٹیبل کو بلا کر کہا کہ باہر کھڑا رہے اور کسی کو اندر نہ آنے دے۔

"معلوم ہُوا تھا کہ موقعۂ واردات پر ایک عورت کی موجودگی کے نشان ملے ہیں"— پیر نے کہا۔

"ہاں جی!"— نادر علی نے کہا— "ملے ہیں"۔

"عورت کا کچھ پتہ چلا کون تھی؟"— پیر نے پوچھا۔

"اگر آپ کوئی خاص بات کرنے آئے ہیں تو فوراً وہ بات کر ڈالیں"— نادر علی نے کہا— "میں بہت مصروف آدمی ہوں"۔

"میں نے اس عورت کا سراغ لگا لیا ہے"— پیر نے کہا— "وہ ایک نوجوان لڑکی ہے اور یہ وہ لڑکی ہے جس کی منگنی مقتول کے ساتھ ہوئی تھی لیکن مقتول اور اس لڑکی کے بھائی رحمان کو عمر قید سنا دی گئی تو لڑکی والوں نے منگنی توڑ دی۔ یہ دونوں اپیل میں بری ہوگئے تو بھی لڑکی کے والدین لڑکی مقتول کو دینے پر راضی نہیں ہوئے"۔

اس لڑکی کا نام سکینہ تھا۔ پیر کو اس لڑکی کا سراغ اس طرح ملا کہ سلیم کے قتل کی اگلی شام گہری ہو گئی تو ایک آدمی اور ایک عورت ایک نوجوان لڑکی کو

پیر کے گھر لے گئے۔ یہ میاں بیوی اس پیر کے مرید تھے اور یہ لڑکی ان کی بیٹی تھی۔ انہوں نے دستور کے مطابق پیر کو نذرانہ پیش کیا اور کہا، ان کی بیٹی ڈر گئی ہے۔

پیر نے لڑکی کو دیکھا۔ اس کا چہرہ اور باہر کو نکلی ہوئی آنکھیں اور بکھرے ہوئے بال بتا رہے تھے کہ ذہنی طور پر اس کی حالت ٹھیک نہیں اور اس پر آسیبی سایہ ہے یا اس پر جِنّ قابض ہو جاتا ہے۔

پیر کے کہنے پر انہوں نے بتایا کہ آدھی رات کے بہت بعد ان کو اس بیٹی کی چیخ سنائی دی۔ وہ رات الگ کمرے میں تنہا ہوتی تھی۔ اس نے اپنا کمرہ اس وجہ سے الگ کیا ہُوا تھا کہ وہ میٹرک کا پرائیویٹ امتحان دینا چاہتی تھی۔ رات کو وہ الگ کمرے میں بیٹھ کر پڑھتی تھی۔

اس کی چیخ سن کر سارا گھر جاگ اٹھا اور اس کے کمرے میں گئے۔ وہ چارپائی پر اس پوزیشن میں بیٹھی ہوئی تھی کہ دونوں ہاتھ سر کے دائیں بائیں رکھے ہوئے، آنکھیں بہت زیادہ کُھلی ہوئیں اور وہ اس طرح ایک جگہ نظریں جمائے ہوئے تھی جیسے اس کو کچھ نظر آرہا ہو۔

ماں نے اس کے پاس بیٹھ کر اس کو اپنے بازوؤں میں لے لیا اور پوچھا کہ وہ خواب میں ڈر گئی ہے؟ کیا ہُوا ہے؟

"وہ مجھ کو مار ڈالیں گے"— سکینہ نے سر سے ہاتھ ہٹا کر اپنی گردن پر رکھ دیئے اور سخت خوفزدہ آواز میں بولی— "میرا گلا گھونٹ دیں گے"۔

وہ ماں کے ساتھ لگ گئی اور اس کی حالت ڈرے ہوئے بچے جیسی ہو گئی۔

اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ اس نے ساری رات اسی طرح گزار دی۔ صبح اس کی آنکھ لگ گئی۔ ڈیڑھ دو گھنٹوں بعد وہ پھر ڈر کر جاگ اٹھی اور اس کی حالت خوفزدگی والی ہی تھی لیکن اتنی خراب نہیں تھی جتنی رات کو تھی۔

گھر والے ایک اور بات سے بہت پریشان ہو گئے۔ وہ یہ کہ لڑکی چارپائی سے اٹھی تو دیکھا کہ سلیپر کا ایک پاؤں پڑا تھا' دوسرا نہیں۔ اس نے چارپائی کے نیچے دیکھا۔ گھر والوں نے بھی بہت ڈھونڈا۔ دوسرا پاؤں نہ ملا۔ یہ بھی دیکھا گیا کہ جو پاؤں وہاں پڑا ہُوا تھا وہ پانی سے بھیگا ہُوا تھا۔ لڑکی سے پوچھا تو اس کو پھر دہشت زدگی کا دَورہ پڑ گیا۔ وہ خود حیران تھی کہ دوسرا پاؤں کہاں ہے اور جو پاؤں موجود ہے وہ بھیگا ہُوا کیوں ہے۔

یہاں میں ایک فالتو بات کہنا چاہتا ہوں۔ ہم لوگ کوئی ایسی چیز دیکھتے ہیں یا کسی کی کوئی ایسی حرکت دیکھتے ہیں جو ہماری سمجھ میں نہ آتی ہو تو ہم اپنی عقل استعمال کرنے کی بجائے پیروں اور عاملوں کے آگے جا ماتھے رگڑتے اور ان کی ہر بات سچ مان لیتے ہیں۔ پیر اور عامل لوگوں کے مسائل کو پُراسرار بنانے میں مہارت رکھتے ہیں۔ پچاس سال پہلے تو تعلیم کی کمی تھی۔ خاص کر مسلمان تو تعلیم سے دُور بھاگتے تھے اور انہوں نے اپنی قسمت پیروں اور عاملوں کے حوالے کی ہوئی تھی۔ حیرت کی بات ہے کہ اب گھر گھر تعلیم پہنچ گئی ہے۔ سائنسی علوم میں بھی مسلمانوں نے ڈگریاں لے لی ہیں لیکن میرا مشاہدہ ہے کہ لوگ حقیقت کو سمجھنے کی بجائے عاملوں کے جال میں پہلے کی نسبت زیادہ پھنس رہے ہیں۔

سکینہ کا مسئلہ آپ کو سنا رہا ہوں۔ اس کے گھر والوں نے یہ انکوائری کرنے کی بجائے کہ ان کی لڑکی کے ایک سلیپر کا پاؤں کہاں غائب ہو گیا ہے اور دوسرا پاؤں کہاں بھیگا ہے' خود ہی تشخیص کر لی کہ لڑکی پر کوئی آسیبی اثر ہو گیا ہے یا اس پر جِنّ آنے لگا ہے۔ اخلاق اور چال چلن کے لحاظ سے لوگ اس گھرانے کو شریف گھرانہ کہا کرتے تھے۔ سکینہ پردہ نشین لڑکی تو نہیں تھی' وہ بغیر بُرقعے

کے باہر نکلا کرتی تھی' پھر بھی اس کے چال چلن پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس کے گھر والوں نے اس پر ایسا شُبہ نہ کیا کہ وہ رات کہیں باہر نکل گئی تھی۔

شام کا اندھیرا گہرا ہو گیا تو سکینہ کے باپ نے اس کی ماں کو ساتھ لیا اور اس پیر کے گھر چلے گئے۔ پیر کو اس کی ساری کیفیت بتائی اور یہ خاص طور پر بتایا کہ اس کے سلیپر کا ایک پاؤں غائب ہے اور دوسرا پاؤں موجود ہے وہ بھیگا ہُوا ہے۔

یہاں میں آپ کو ایک دلچسپ بات سناتا ہوں۔ کسی پر کالا جادو کرانا ہو تو اس کے سر کے ایک دو بال کالا عامل طلب کرتا ہے۔ اس شخص کے ایک پاؤں کی جوتی بھی کالے عمل میں استعمال ہوتی ہے۔ یہ میرا ذاتی مشاہدہ اور تجربہ بھی ہے۔ اس پیر نے ان لوگوں کو یہ تو نہ بتایا کہ لڑکی رات کو کہیں باہر چلی گئی ہو گی اور ہو سکتا ہے کہ وہاں سے اسے بھاگنا پڑا اور ایک سلیپر وہاں رہ گیا ہو گا۔ اس کی بجائے اس نے سکینہ کے والدین کو یہ بتایا کہ کسی دشمن نے اس کے سلیپر کا ایک پاؤں اُڑا لیا ہے اور وہ کسی عامل کے پاس پہنچا دیا ہے۔

"دو باتیں ہو سکتی ہیں" ــــ پیر نے کہا ــــ "کسی نے اس پر کالا جادو کر دیا ہے اور وہ اس لئے کیا ہو گا کہ اس کو اس لڑکی کا رشتہ مل جائے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس پر جِنّ کا قبضہ ہو گیا ہے یا آسیبی سایہ پڑ گیا ہے۔ میں معلوم کر لوں گا لیکن پہلے اس لڑکی کو ایک دو تعویذ دوں گا۔ رات ہی رات میں راز میرے سامنے آجائے گا اور لڑکی کو رہائی مل جائے گی"۔

پیر نے یہ ساری باتیں نادر علی خان کو بتائیں۔ اس نے بتایا کہ اس نے لڑکی کے واسطے تعویذ دیئے۔ ایک تعویذ گلے میں ڈالنے والا تھا اور دوسرا پانی میں گھول کر پلانا تھا۔ اس نے لڑکی کو اگلے دن لانے کو کہا۔

پھر سینگوں والے انسان آ گئے

اگلی رات لڑکی کو پھر وہاں لے گئے۔ لڑکی کی حالت میں کوئی خاص تبدیلی نہ آئی۔ اس کی خوفزدگی پہلے جیسی رہی۔ پیر نے سکینہ کو اپنے سامنے بٹھالیا۔

"دیکھ لڑکی!" ___ پیر نے سکینہ کو کہا ___ "یہ کوئی جنّ بھُوت نہیں ہے اور ہم جانتے ہیں کہ تمہاری یہ حالت بناوٹی نہیں۔ تم واقعی بہت خوفزدہ ہو۔ ہم نے دیکھ لیا ہے کہ تم کہاں گئی تھیں اور ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ تمہارے سلیپر کا دوسرا پاؤں اس وقت کہاں ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ تم جہاں سے ڈری ہو وہاں تمہارے آگے بھی پانی تھا' دائیں طرف بھی پانی تھا اور بائیں طرف بھی پانی تھا۔ ہم تمہارا پردہ رکھنا چاہتے ہیں۔ تم سے ہمارا کوئی مطالبہ نہیں۔ تم خود اپنی زبان سے بتا دو کہ یہ کیا معاملہ ہے اور وہاں کیا ہُوا تھا۔ ہم تمہاری عزت اور آبرو کو اپنی عزت اور آبرو سمجھیں گے۔ تم دَورے کی اس حالت میں اپنی گردن پر ہاتھ رکھ کر کہتی ہو کہ وہ میرا گلا گھونٹ دیں گے۔ اگر تم ہم سے اصل بات چھپاؤ گی تو دو تین دنوں کے اندر اندر تمہارا گلا تمہارے اپنے ہاتھوں گھونٹا جائے گا اور تم تڑپ تڑپ کر مرجاؤ گی"۔

میں آپ کو پہلے سنا چکا ہوں کہ یہ پیر اصل میں کیا چیز تھا اور نادر علی خان نے اس کو لگام ڈالی ہوئی تھی۔ نادر علی خان نے اس کو کہہ دیا تھا کہ اپنی منڈی چلاتے رہو لیکن بدمعاشوں اور جرائم پیشہ آدمیوں کی پشت پناہی نہ کرنا۔

پیر نے نادر علی خان کو بتایا کہ اس کو پہلے دن ہی پتہ لگ گیا تھا کہ جائے واردات پر ایک عورت بھی تھی اور زنانہ سلیپر کا ایک پاؤں پانی میں سے ملا تھا۔ پیر کو یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ جائے واردات پر اسی سلیپر کے کھُرے تھے۔ یہی باتیں ذہن میں رکھ کر اس نے سکینہ کو اتنا ڈرایا کہ اس نے اصل راز پیر کے

سامنے رکھ دیا۔ پیر نے اس کو بہت شاباش دی اور حلفیہ وعدہ کیا کہ وہ اس کے راز کو اپنے دل میں دفن کر دے گا۔

یہ پیر پیروں کی طرح بدکار آدمی تھا۔ یہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اتنی خوبصورت اور نوجوان لڑکی کی عصمت کے ساتھ نہ کھیلتا لیکن اس نے ایسی کوئی بیہودہ حرکت نہ کی جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ نادر علی کے آگے اپنے نمبر بنانا چاہتا تھا۔ وہ پولیس اور مجرموں کی دنیا سے واقف تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ تھانیدار یہی راز حاصل کرنے کے واسطے پریشان ہو رہا ہو گا کہ جائے وقوعہ پر جس لڑکی کے کھُرے ملے ہیں وہ کون تھی۔ اس کا کام بن گیا۔ لڑکی نے راز کھول دیا۔

راز یہ تھا کہ سکینہ کی منگنی سلیم مقتول کے ساتھ ہو چکی تھی لیکن سلیم کو عمر قید ملنے کی وجہ سے منگنی منسوخ ہو گئی۔ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ مقتول سکینہ کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے لیکن یہ کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ سکینہ بھی صرف سلیم کو ہی چاہتی تھی اور ان کی درپردہ ملاقاتیں بھی ہوتی رہی تھیں۔ مقتول کے دل میں سکینہ کی محبت اتنی زیادہ تھی کہ اس نے سکینہ کے بھائی کے خون کا بدلہ لینے کے واسطے خواجہ کے بیٹے کو قتل کر دیا تھا۔ ظاہری طور پر تو یہ معاہدہ مقتول اور سکینہ کے بھائی رحمان کے درمیان ہوا تھا کہ مقتول خواجہ کے بیٹے کو قتل کر دے گا اور رحمان اپنی بہن کا رشتہ مقتول کو دلا دے گا۔ مقتول نے سکینہ کو بتا دیا تھا کہ اس نے اس کے بھائی کے خون کا بدلہ لے لیا ہے۔

سکینہ تو مقتول پر دل و جان سے فدا تھی۔ اب اس کی پجارن بن گئی مگر آگے چل کر منگنی منسوخ ہو گئی۔ مقتول اور سکینہ پر تو غم کا پہاڑ آ پڑا۔ سکینہ نے پیر کو بتایا کہ وہ مقتول کو ملی اور اس کو کہا کہ اگر وہ چاہے تو وہ اس کی خاطر اپنا گھر چھوڑ دے گی۔ مقتول نے اس کو بتایا کہ وہ ایک عامل کے پاس جا رہا

ہے۔ سنا ہے کہ یہ عامل اس قسم کے کام کر دیتا ہے اور پیسے واجبی سے لیتا ہے۔

سکینہ نے پیر کو بتایا کہ مقتول فتح شاہ کے پاس گیا اور اس کو بتایا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ فتح شاہ مقتول جیسے جوانوں سے ہی کمایا کرتا تھا۔ اگر سائل کوئی عورت ہوتی تو فتح شاہ اس سے کیش' کے علاوہ عصمت کی قیمت بھی وصول کر لیا کرتا تھا۔

فتح شاہ نے مقتول کو اس عمل کے چھ سو روپے بتائے۔ ساڑھے تین سو پر سودا طے ہو گیا۔ یہ ذہن میں رکھیں کہ وہ ساڑھے تین سو روپے آج کے بیس ہزار روپوں کے برابر تھے۔ فتح شاہ نے مقتول کو یہ عمل بتایا جو وہ وقوعہ کی جگہ پر کرنے گیا تھا۔ فتح شاہ نے جگہ وہ بتائی تھی جہاں دریا' ندی یا نالے کا پانی دو شاخہ ہوتا ہے۔ اس نے مقتول کو یہ بھی بتایا تھا کہ جس لڑکی کے ساتھ وہ شادی کرنا چاہتا ہے اور جس کے واسطے یہ عمل کیا جا رہا ہے' وہ لڑکی اگر ساتھ ہو تو اس عمل کا نتیجہ سو فیصد وہی ہوتا ہے جس کے واسطے یہ کیا جاتا ہے اور نتیجہ بہت جلدی حاصل ہو جاتا ہے۔ لڑکی کا کام یہ بتایا گیا تھا کہ کورے دِیئے کے اندر جو بتّی جلانی تھی وہ لڑکی اپنے ہاتھ سے جلائے۔ یہ عمل پورا ایک گھنٹہ کرنا تھا۔

سکینہ نے پیر کو بتایا کہ مقتول نے اس کے ساتھ اس عمل کا ذکر کیا تو سکینہ اس کے ساتھ جانے پر تیار ہو گئی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لڑکی کے دل میں مقتول کی کتنی زیادہ محبت تھی اور وہ اس معاملے میں کتنی دلیر تھی۔ میں نے پہلے سنایا ہے کہ لڑکی نے اپنا کمرہ الگ رکھا ہُوا تھا۔ اس کمرے کا ایک دروازہ پچھلی طرف بھی کھلتا تھا۔ ظاہری طور پر لڑکی الگ کمرے میں پڑھنے کے واسطے رہتی تھی لیکن یہ کمرہ لینے کی اصل وجہ یہ تھی کہ رات کو کبھی کبھی پچھلے دروازے سے تھوڑی دیر کے واسطے باہر چلی جاتی تھی اور مقتول کے ساتھ دو چار باتیں کر کے واپس آجاتی تھی۔

اُس رات مقتول کے ساتھ اس کے جانا بڑا خطرناک اقدام تھا۔ ایک تو قصبے سے باہر جانا تھا اور جانا بھی ویران علاقے میں تھا جہاں اس کو ایک گھنٹہ رہنا تھا۔ وقت آدھی رات کا تھا۔ وہ مقررہ وقت پر کمرے سے نکل گئی۔ مقتول نے اس کو جگہ بتا دی تھی۔ اپنے آپ کو چھپانا بہت مشکل تھا۔ وجہ یہ تھی کہ چاند پورا تھا۔ اس کو صرف یہ فائدہ حاصل تھا کہ موسم سخت سردیوں کا تھا جس کی وجہ سے لوگ اپنے اپنے گھروں میں دبکے ہوئے گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔

لڑکی نے بتایا کہ مقتول اس کو مل گیا۔ مقتول نے دن کو جگہ دیکھ لی تھی۔ دونوں وہاں چلے گئے۔ ابھی وہ عمل شروع کرنے کی تیاری کر ہی رہے تھے کہ نالے کے ایک اونچے کنارے کے اندر سے دو آدمی نکلے۔ وہاں نالے میں خاصا چوڑا شگاف تھا۔ یہ آدمی اس شگاف سے نکلے تھے۔ وہ دراصل آدمی نہیں تھے۔ ان کی ٹانگیں اور بازو وغیرہ تو انسانوں جیسے تھے لیکن ان کے چہرے بہت بڑے بڑے تھے۔ دونوں کے سروں پر سینگ تھے۔ ان کے دانت بڑے لمبے لمبے تھے۔ ان کے سروں پر کالے کالے کپڑے پڑے ہوئے تھے جو ان کے کندھوں سے نیچے تک آئے ہوئے تھے۔

وہ ایسی آوازیں نکالتے آرہے تھے جیسے بادل گرج رہے ہوں۔ سکینہ اور مقتول اس طرح کھڑے رہے جیسے بُت بن گئے ہوں۔ سکینہ نے اپنی حالت اس طرح بتائی کہ اس کے منہ سے آواز تک نہیں نکلتی تھی۔ اس نے بھاگنے کا ارادہ کیا تو اس کو پتہ لگا کہ اس میں قدم اٹھانے کی بھی طاقت نہیں رہی۔

وہ دونوں جو کچھ بھی تھے مقتول اور سکینہ کے اردگرد ناچنے کے انداز سے گھومنے لگے۔ مقتول سُن ہو کر کھڑا تھا۔ اچانک ان میں سے ایک نے مقتول کے پیچھے ہو کر اس کی گردن میں رسّی پھینکی اور پیچھے سے وہ آدمی رسّی کو مروڑنے اور کھینچنے لگا۔ دوسرے نے مقتول کے منہ اور ناک پر ہاتھ رکھ دیا۔

سکینہ نے پیر کو بتایا کہ اچانک اس کے جسم میں جان واپس آگئی اور وہ نالے سے باہر جانے والی گھاٹی کی طرف دوڑ پڑی۔ وہ نالے سے نکل آئی۔ راستے میں اس کو پتہ لگا کہ اس کے ایک پاؤں میں سلیپر نہیں ہے۔ وہ پھر بھی نہ رکی۔ اس کے پیچھے کوئی بھی نہیں آرہا تھا لیکن وہ گھر سے نکلی ہوئی نوجوان لڑکی تھی۔ وہ اتنی نڈر نہیں ہو سکتی تھی کہ اپنا سلیپر اٹھالانے کے واسطے واپس چلی جاتی۔

وہ گھر میں داخل ہو گئی۔ یہ اُس کا اپنا کمرہ تھا۔ گھر والے گہری نیند سوئے تھے۔ اس سے اس کو اطمینان ہو گیا کہ وہ پکڑی نہیں جائے گی بڑی مشکل سے اس کی آنکھ لگی۔ معلوم نہیں کتنا وقت گزرا ہو گا کہ درندوں جیسے دو ہاتھ اس نے اپنی گردن کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھے اور اس کو سینگوں اور لمبے دانتوں والے چہرے نظر آئے۔ اس کی چیخیں نکل گئیں اور اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کے کمرے کا اندرونی دروازہ کھلا۔ اس کا باپ' پھر اس کی ماں' اس کا بھائی رحمان اور بہن کمرے میں داخل ہوئے۔

ماسک کے پیچھے کون تھا؟

یہ تو میں سنا چکا ہوں کہ اس کو پیر تک کس طرح پہنچایا گیا۔ اس نے پیر کو یہ سارا واقعہ سنا دیا۔ پیر نے اس کو پھر تسلی دی کہ اس کے راز کو وہ ظاہر نہیں ہونے دے گا لیکن یہ واقعہ ایک اور آدمی کو سنانا پڑے گا پھر اس کے دَورے ختم ہو جائیں گے اور اس کو کوئی نقصان نہیں ہو گا۔

پیر نے اس کو تعویذ دیئے اور اس کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ وہ اب ڈرے نہیں۔ پیر نے یہ بھی کہا کہ یہ دونوں چیزیں انسان نہیں بلکہ جِنّات تھے۔ پیر نے اس کو یقین دلایا کہ یہ جنات اس کے قبضے میں ہیں۔

پیر نے لڑکی کے والدین کو بلا کر ان کو تسلیاں اور دلاسے دیئے کہ لڑکی پر جِنّات نے حملہ کیا تھا اور یہ دونوں جن اب اس کے قبضے میں ہیں۔ پیر نے ان سے نذرانہ وصول کر کے رخصت کر دیا۔

دوسرے دن پیر تھانے چلا گیا اور نادر علی کو یہ واقعہ سنایا۔ نادر علی کے واسطے یہ نشاندہی بہت ہی قیمتی تھی۔ اس نے پیر کو بہت شاباش دی اور کہا کہ وہ اس لڑکی کو تھانے بلائے گا لیکن خطرہ یہ تھا کہ لڑکی انکاری نہ ہو جائے۔ پیر نے اس کو کہا کہ وہ لڑکی کو تیار کر لے گا۔

اسی دن کے پچھلے پہر پیر نے یہ کارنامہ بھی کر کے دکھا دیا کہ وہ لڑکی کو اس کے باپ کے ساتھ تھانے لے آیا۔ نادر علی نے لڑکی کے ساتھ ایسا مشفقانہ برتاؤ کیا کہ لڑکی کے دل پر جو خوف تھا وہ ختم ہو گیا۔

نادر علی کے کہنے پر لڑکی نے یہ سارا واقعہ جو اس نے پیر کو سنایا تھا نادر علی کو سنا دیا۔ یہاں سے نادر علی نے اپنی وہ خصوصی عقل استعمال کرنی شروع کی جس کی بدولت اس نے شہرت حاصل کی تھی۔ اس کے ذہن میں ان دونوں آدمیوں کے چہرے آگئے جو لڑکی کہتی تھی کہ سر پر سینگ تھے اور دانت بہت لمبے تھے۔ نادر علی نے سکینہ سے ان چہروں کی ایک ایک لکیر پوچھنی شروع کر دی۔

سکینہ نے ہر ایک تفصیل بتائی تو نادر علی کو بڑا پکا شک ہو گیا کہ ان دونوں قاتلوں نے گتّے کے بنے ہوئے وہ رنگ دار ماسک اپنے چہروں پر چڑھائے ہوئے تھے جن کا میں نے پہلے ذکر کیا ہے۔ اس دور میں یہ ماسک زیادہ تر بڑے شہروں میں پائے جاتے تھے۔ قصبوں میں یہ اتنے عام نہیں تھے۔ آج کل تو یہ گلی گلی بکتے ہیں اور بچے چہروں پر چڑھائے پھرتے ہیں۔

نادر علی نے سکینہ سے پوچھا کہ اس نے ایسا ماسک کبھی نہیں دیکھا؟ سکینہ

کو یاد آگیا کہ ایک بار وہ راولپنڈی گئی تھی اور وہاں اس نے ایک بچے کو یہ ماسک چڑھائے ہوئے دیکھا تھا۔ جب اس کو وہ ماسک یاد آیا تو اس نے کہا کہ مقتول پر حملہ کرنے والوں نے شاید ماسک چڑھائے ہوئے تھے۔

نادر علی کو خیال آیا کہ وہ فتح شاہ کے گھر گیا تھا تو اندر سے بارہ تیرہ سال عمر کا ایک لڑکا نکلا تھا۔ اس کے چہرے پر ایسا ہی ماسک چڑھا ہُوا تھا جو اُس نے فوراً اتار لیا تھا۔ اب نادر علی کو وہ بچہ یاد آیا تو اس کو ایسا شک ہوا کہ ملزموں نے یہی ماسک استعمال کیا ہو گا اور دوسرے ملزم کا ماسک بھی اسی گھر میں ہو گا۔ ایسا شک نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ فتح شاہ اپنے ایسے سائل کو تو نہیں مروانا چاہتا تھا جس سے اس نے ساڑھے تین ہزار روپیہ پیشگی لے لیا تھا۔

تھوڑا اور غور کرنے کے بعد نادر علی کو ایک سوچ آئی۔ یہ مدھم سا ایک خیال تھا کہ ہو سکتا ہے فتح شاہ کو معلوم ہو کہ اس کا یہ عمل کامیاب نہیں ہو گا۔ اس نے مقتول سے پوری رقم پیشگی وصول کر لی تھی۔ یہ معمولی رقم نہیں تھی۔ اس نے محسوس کر لیا ہو گا کہ مقتول کا کام نہیں ہو گا تو وہ اپنی رقم کا مطالبہ کرے گا۔ بہتر ہے کہ اس سائل کو اُڑا ہی دو۔ فتح شاہ جرائم پیشہ تھا۔

نادر علی کے دماغ نے اس شک پر اتنا نہ سوچا جتنا اس سوچ نے اس کے دماغ کو مصروف کر لیا کہ وہ جائے وقوعہ سے برآمد ہونے والی اشیاء فتح شاہ کے پاس لے گیا تھا تو ان پر گفتگو کے دوران نادر علی نے اس سے پوچھا تھا کہ یہ اشیاء اس کی دی ہوئی تو نہیں؟ فتح شاہ نے صاف انکار کیا تھا اور کہا تھا کہ وہ مقتول کو جانتا تک نہ تھا۔ اب سکینہ نے نہ صرف یہ بتایا کہ مقتول کو یہ اشیاء فتح شاہ نے دی تھیں بلکہ وہ رقم بھی بتا دی تھی جو اس نے مقتول سے پیشگی وصول کی تھی۔

سکینہ اپنے باپ اور پیر کے ساتھ تھانے آئی تھی۔ نادر علی نے دونوں کو

اندر بلایا اور ان کا خاص طور پر باپ کا' حوصلہ مضبوط کیا اور ان کو خراجِ تحسین پیش کیا کہ انہوں نے ذمہ دار شہریوں کا رول ادا کیا ہے۔

سکینہ کے باپ نے اس خدشے کا اظہار کیا کہ اس کی بیٹی جب عدالت میں گواہی دے گی تو اس کے خاندان کی بہت بے عزتی ہو گی۔ صفائی کے وکیل بہت ہی بیہودہ جرح کریں گے۔

"دعا کرو ملزم پکڑے جائیں"—— نادر علی نے کہا—— "میں پوری کوشش کروں گا کہ سکینہ کو عدالت میں پیش نہ کروں۔ اس نے مجھ کو راز کی بات بتا دی ہے۔ میں اس کو یہی انعام دے سکتا ہوں کہ اس کی عزت کی حفاظت کروں۔ یہ میں کر کے دکھا دوں گا"۔

نادر علی نے ان تینوں کو گھر بھیج دیا اور ایک ہیڈ کانسٹیبل کو بلا کر کہا کہ فتح شاہ کو اپنے ساتھ لے آئے۔

جِنّ بھُوت نہیں تھے

اس شک کی بھی گنجائش موجود تھی کہ سکینہ کے بھائی رحمان نے سکینہ کو مقتول کے ساتھ دیکھ لیا ہو گا اور کسی راز دار دوست کو ساتھ لے آیا اور مقتول کو اُس بہروپ میں اپنے چہرے چھپا کر قتل کر دیا۔ لیکن یہ شک صحیح معلوم نہیں ہوتا تھا۔ غور کریں کہ جن آدمیوں کو سکینہ نے مقتول کو قتل کرتے دیکھا تھا' وہ خاص قسم کے لباس میں اور خاص قسم کا حلیہ بنا کر آئے تھے اور وہ جب سامنے آئے تو انہوں نے منہ سے خاص قسم کی آوازیں نکالی تھیں' اور پھر انہوں نے مقتول اور سکینہ کے اِرد گِرد چکر لگا کر خاص قسم کا رقص کیا تھا۔

انہوں نے یہ سب کچھ اچانک نہیں کر لیا تھا۔ یہ اہتمام کچھ دنوں کی پلاننگ سے کیا گیا تھا۔ شاید ریہرسل بھی کی گئی ہو گی۔

ایک بات اور نادر علی کے دماغ میں آئی جو یہ تھی کہ ان قاتلوں کو یقیناً معلوم تھا کہ فلاں رات اور فلاں وقت مقتول اس جگہ ہو گا۔

پھر ایک اور بات قابلِ غور تھی۔ ایک نوجوان لڑکی جائے وقوعہ پر موجود تھی۔ اس کی طرف ملزموں نے توجہ ہی نہیں دی۔ لڑکی وہاں سے بھاگی تو ملزموں نے اس کا پیچھا نہ کیا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ملزموں کو صرف یہ کام دیا گیا تھا کہ سلیم کو قتل کرنا ہے۔

فتح شاہ آگیا۔ نادر علی نے اسی وقت اُس کو لپیٹ میں لے لیا۔ پہلے تو اس کی تواضع ایک درجن گالیوں سے کی پھر اس کو کرسی پر بٹھانے کی بجائے بنچ پر بٹھایا۔

"تُو نے کہا تھا کہ مقتول میرے پاس کبھی نہیں آیا تھا"——نادر علی نے کہا——"پھر تُو نے کہا تھا کہ یہ نقش تیرا لکھا ہُوا نہیں اور تو اس سارے عمل کا مطلب ہی نہیں سمجھتا۔ راز یہ کھلا ہے کہ مقتول سے تُو نے ساڑھے تین ہزار روپیہ وصول کر لیا تھا۔ اب یہ بتا کہ تُو نے میرے آگے جھوٹ کیوں بولا تھا؟"

"سیدھی سی بات ہے حضور!"——فتح شاہ نے کہا——"کالا علم خطرناک ہوتا ہے۔ میں ڈرتا تھا کہ یہ عمل اُلٹ پڑ گیا اور اس شخص کی جان چلی گئی تو میں پکڑا جاؤں گا۔ میں نے اس کو کہہ دیا تھا کہ اس عمل کے اُلٹے اثر کا ذمہ دار میں نہیں ہوں گا۔ وہی ہُوا جس کا مجھ کو ڈر تھا.... میں آپ کو بتاؤں سرکار؟.... مجھ کو اس شخص کے مرنے کا افسوس اس وجہ سے زیادہ ہے کہ ایک موٹی اسامی ہاتھ سے نکل گئی ہے۔ اس عمل کا اس کو معمولی سا فائدہ ہونا تھا' پھر میں نے اس سے مزید تین ساڑھے تین ہزار وصول کر لینے تھے"۔

یہ معاملہ قابلِ غور تھا کہ اس شخص کے پاس سلیم کو قتل کرنے کی کوئی وجہ

نہیں تھی۔ صرف یہ وجہ ہو سکتی تھی کہ مقتول کو قتل کرانے کے واسطے فتح شاہ کو استعمال کیا گیا ہو۔ قتل کرانے والا وہ شخص خواجہ ہی ہو سکتا تھا لیکن نادر علی سوچتا تھا کہ قتل کرانے کا یہ طریقہ خواجہ جیسا آدمی اختیار نہیں کر سکتا۔ یہ تو باقاعدہ ڈرامہ تیار کیا گیا تھا۔

فتح شاہ بہت ہی چالاک آدمی تھا۔ اس نے اپنی صفائی میں جو باتیں کیں وہ قابلِ قبول تھیں لیکن اس کو چھوڑ دینا عقل مندی نہیں تھی۔ نادر علی نے اس کو الگ بٹھا دیا اور کہا کہ سوچو اور سچ بتاؤ کہ تم نے یہ جھوٹ کیوں بولا تھا کہ تم سلیم کو جانتے ہی نہیں تھے۔

نادر علی کو اس ماسک کا خیال آگیا جو فتح شاہ کے گھر کے ایک لڑکے نے اپنے منہ پر چڑھایا ہُوا تھا۔ اس نے اپنے ایک اے ایس آئی کو اس ماسک کے بارے میں اچھی طرح سمجھایا اور کہا کہ وہ فتح شاہ کے گھر جائے اور یہ ماسک لے آئے۔ اگر یہ پھٹ گیا ہو تو بھی لے آئے۔

اے ایس آئی سائیکل پر گیا اور ماسک لے آیا۔

نادر علی یہ ماسک سکینہ کو دکھانا چاہتا تھا۔ وہ اس لڑکی کو اسی وقت تھانے بلوا سکتا تھا۔ خود اس کے گھر چلا جاتا لیکن وہ ایک نوجوان مسلمان لڑکی کو بار بار تھانے بلوانا مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ سکینہ کو وہ پردے میں ہی رکھے۔

وہ شام کے بعد پرائیویٹ کپڑوں میں سکینہ کے گھر گیا اور اس کے والدین کی موجودگی میں اس کو ماسک دکھایا پھر یہ ماسک اپنے چہرے پر چڑھایا اور سر پر اس گھر کا ایک کالا دوپٹہ دوہرا کر کے اسی طرح ڈالا جس طرح سکینہ نے اپنے بیان میں بتایا تھا کہ ان آدمیوں کے سروں پر پڑے ہوئے تھے۔

"بالکل یہی!"——سکینہ نے کہا——"ان کے چہرے اسی طرح تھے"۔

"اب تو ڈر نہیں لگا؟" — نادر علی نے پوچھا۔

"نہیں!" — سکینہ نے جواب دیا۔

"وہ انسان تھے" — نادر علی نے کہا — "جن بھوت نہیں تھے"۔

نادر علی آگیا اور اس نے یہ ماسک اپنے قبضے میں رکھ لیا۔ فتح شاہ کو اس نے رات تھانے میں ہی رکھا۔

اگلی صبح نادر علی تھانے گیا۔ تھانے میں اور کئی کام ہوتے ہیں۔ نادر علی ایسے ہی کاموں میں مصروف ہو گیا۔ دس بجے کے کچھ بعد سکینہ کا باپ اس کے پاس آگیا۔ بیٹی کی حرکت پر وہ پہلے ہی پریشان تھا لیکن اُس روز اُس کا رنگ اُڑا ہُوا تھا اور اس کے منہ سے ٹھیک طرح بات بھی نہیں نکلتی تھی۔

"ذرا حوصلے میں آکر بات کریں" — نادر علی نے کہا — "کوئی نیا واقعہ ہو گیا ہے؟"

"میرا بیٹا رحمان شام کھانا کھا کر نکلا تھا" — اس نے کہا — "اس کا کُتا اس کے ساتھ تھا۔ رات تقریباً گیارہ بجے کُتا واپس آگیا' رحمان نہیں آیا۔ کُتا بار بار باہر کو دوڑتا تھا۔ ہم نے کُتے کو باندھ دیا اور وہ ساری رات بڑی بے چینی سے چُوں چُوں کرتا رہا۔ رحمان ابھی تک واپس نہیں آیا"۔

"کیا وہ شام کو کُتے کے ساتھ لے کر روزانہ باہر جایا کرتا تھا؟" — نادر علی نے پوچھا — "کُتا کیسا ہے؟ اچھی نسل کا ہے؟ کیا اسے رحمان نے رکھا ہُوا ہے؟.... مجھ کو ہر بات بتائیں"۔

"اسے ہم رحمان کا کُتا کہا کرتے ہیں" — اس نے جواب دیا — "ایلیشیئن نسل کا بہترین کُتا ہے۔ کبھی کبھی دوستوں کے ساتھ رحمان اسے شکار پر لے جایا کرتا ہے۔ رحمان کے تین دوست ہیں جنھوں نے کُتے رکھے ہوئے ہیں۔ یہ کُتا رحمان سے اتنا پیار کرتا ہے کہ اسے دیکھتا ہے تو اس طرح حرکتیں

کرنے لگتا ہے جس طرح دودھ پیتا بچّہ ماں کو دیکھ کر کرتا ہے۔ رحمان جب تک اس کے ساتھ کچھ دیر کھیل نہ لے کُتے کو چین نہیں آتا"۔

"گھر کے کسی اور فرد کے ساتھ اتنا پیار نہیں کرتا؟" — نادر علی نے پوچھا۔

"بالکل نہیں!" — اس نے جواب دیا — "صرف رحمان.... کبھی تو رحمان اسے رات کو اپنی چارپائی کے نیچے سلاتا ہے۔ روزانہ شام کھانے کے بعد رحمان کُتے کو ٹہلائی کے لئے باہر لے جاتا ہے۔ اس کے دوست بھی کُتے لے آتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے بعد اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں"۔

نادر علی نے اس سے رحمان اور کُتے کی اور بھی کچھ باتیں پوچھیں اور اس کو کہا کہ رحمان کے ان دوستوں کو ساتھ لے آئیں اور اگر کوئی اور بھی ان کے ساتھ تھا تو اس کو بھی لے آئیں۔

رحمان کا کُتا

نادر علی کے دماغ میں ایک شک یہ آیا کہ سلیم کا قاتل رحمان ہو سکتا ہے اور وہ خود ہی غائب ہو گیا ہے۔ بے شک سلیم کے ساتھ اس کی گہری دوستی تھی لیکن سلیم کی یہ حرکت برداشت نہیں کر سکا ہو گا کہ وہ اس کی بہن کو آدھی رات کے وقت نالے میں لے گیا تھا لیکن نادر علی طریقہ قتل کی سوچتا تھا تو اس کا شک کمزور پڑ جاتا تھا۔

اب نادر علی خان کے دماغ نے اس کی جو راہنمائی کی' اس کو معجزہ بھی کہہ سکتے ہیں لیکن میں اس کو اس کا وہ خداداد وصف سمجھتا ہوں جو کسی کسی کے حصے میں آیا کرتا ہے۔ اس کی ساری توجہ رحمان اور کُتے کے پیار پر تھی اور وہ بہت

جلدی اپنی اس سوچ پر عمل کرنا چاہتا تھا۔

وہ سب رحمان کے دوست تھے جن کو نادر علی نے بلایا تھا۔ اطلاع ملتے ہی وہ آ گئے۔ تین وہ تھے جنہوں نے کُتے رکھے ہوئے تھے اور دو اور تھے۔ نادر علی نے سب کو اکٹھے بٹھا لیا اور کہا کہ وہ بتائیں کہ گزشتہ شام رحمان کتنی دیر ان کے ساتھ رہا اور کیا وہ کسی اور کے ساتھ چلا گیا تھا؟

ان سب نے گزشتہ شام کی جو روئیداد سنائی' اس میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ وہ ہر شام کی طرح اکٹھے ہوئے اور اپنے محلے سے نکل کر کھیتوں کو چلے گئے۔ روز مرّہ کی طرح کُتوں کو کھول دیا اور کُتے کھیتوں میں بھاگتے دوڑتے رہے۔ رحمان کچھ بجھا ہُوا تھا۔ وجہ ظاہر تھی۔ ایک تو اس کا عزیز دوست سلیم قتل ہو گیا تھا اور اس پر ایک چوٹ یہ پڑی تھی کہ اس کی بہن بھی جائے واردات پر موجود تھی اور پولیس نے اس کو شاملِ تفتیش کر لیا تھا۔

نادر علی کے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ اس پر ایسی کیفیت طاری نہیں تھی کہ وہ گھر سے بھاگ جاتا یا کوئی اُلٹی سیدھی حرکت کر گزرتا۔

روز مرّہ کی طرح وہ ایک جگہ رُک کر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ ایک گھنٹے سے کچھ زیادہ ہی وقت گزر گیا ہو گا کہ انہوں نے اپنے اپنے کُتے کو بلایا' انہیں زنجیریں ڈالیں اور آہستہ آہستہ واپس چل پڑے اور محلّے میں آ کر اپنے اپنے گھر کو چلے گئے۔

ان میں سے ایک نے بتایا کہ رحمان گلی میں جا رہا تھا۔ اس لڑکے نے آواز دی —"رحمان"— رحمان اس لڑکے سے دُور چلا گیا تھا۔ چاند ابھی اوپر نہیں آیا تھا۔ اس وجہ سے اتنی دور سے کسی کو پہچانا نہیں جا سکتا تھا۔ اس لڑکے کو اتنا سا نظر آیا کہ رحمان رک گیا تھا اور ساتھ والی گلی سے کوئی نکلا تھا۔ وہ رحمان تک گیا۔ ان میں کوئی بات ہوئی اور رحمان اس کے ساتھ اس گلی میں چلا گیا

جس گلی سے وہ آدمی نکلا تھا۔ یہ لڑکا اپنے گھر چلا گیا۔

پھر ان لڑکوں نے بتایا کہ صبح بہت سویرے رحمان کا باپ ان سب کے گھروں کو گیا اور رحمان کی بابت دریافت کیا۔

نادر علی اٹھ کھڑا ہُوا۔ ایک ہیڈ کانسٹیبل اور دو کانسٹیبلوں کو ساتھ لیا اور رحمان کے باپ کے ساتھ چل پڑا۔ رحمان کے دوستوں کو بھی اس نے ساتھ لے لیا تھا۔

"یا اللہ!"— نادر علی نے ہاتھ اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا اور التجا کی— "مجھ گناہ گار کو اندھیرے میں اپنے نُور کی کرن دکھا دینا"۔

وہ رحمان کے گھر گیا اور اس کے باپ کو کہا کہ وہ اندر جا کر کُتے کو دیکھنا چاہتا ہے۔

"تم تینوں ایک کام کرو"— نادر علی نے ہیڈ کانسٹیبل اور کانسٹیبلوں سے کہا — "ان گلیوں میں اکیلے اکیلے چلے جاؤ اور لوگوں کو کہو کہ کسی گلی میں وہ ٹولیوں اور مجمعے کی صورت میں کھڑے نہ ہوں اور کسی گلی میں رکاوٹ پیدا نہ ہو"۔

یہ صرف نادر علی ہی جانتا تھا کہ وہ کیا کرنے والا ہے۔ رحمان کے باپ نے اس کو اندر چلنے کو کہا۔ وہ اندر گیا۔ صحن میں ایک طرف رحمان کا کُتا بندھا ہُوا تھا۔ بڑی اچھی نسل کا خوبصورت کُتا تھا۔ وہ بہت ہی بے چین تھا۔ جہاں بندھا ہوا تھا وہاں زنجیر کی وجہ سے دائرے میں پھرتا' بے چینی کی آوازیں نکالتا اور آہستہ آہستہ بھونکتا پھر چُوں چُوں کرنے لگتا تھا۔

"جس وقت سے یہ اکیلا گھر آیا ہے اسی طرح کر رہا ہے"— رحمان کی ماں نے روتے ہوئے کہا— "اب تک اس نے کچھ کھایا بھی نہیں"۔

"اس کی زنجیر پٹے سے کھول دو"— نادر علی نے کہا— "اس سے پہلے

یہ دیکھو کہ ڈیوڑھی کے اندر اور باہر والے دروازے کھلے ہیں اور ان میں کوئی کھڑا نہ ہو۔ کُتا باہر کو دوڑے گا۔ اس کا راستہ صاف ہونا چاہئے .... یہی بہتر جانتا ہے کہ اس نے کہاں جانا ہے"۔

رحمان کے باپ نے ڈیوڑھی کے دونوں دروازے کھول دیئے اور جا کر کُتے کے پٹے سے زنجیر اُتار دی۔ کُتا تو جیسے آزاد ہونے کا منتظر تھا۔ اس قدر تیز رفتار سے اس نے حویلی کا صحن عبور کیا اور غائب ہو گیا جیسے رائفل سے گولی نکلتی ہے۔

نادر علی اور رحمان کا باپ دوڑ کر باہر نکلے۔ کُتا اس گلی کا موڑ مُڑ رہا تھا۔ ادھر سے ایک کانسٹیبل آ رہا تھا۔ نادر علی نے اس کو آواز دے کر کہا کہ وہ کُتے کے پیچھے جائے اور دیکھے وہ کدھر جاتا ہے۔

نادر علی دوڑتا ہی جا رہا تھا۔ کُتا تو بہت ہی تیز تھا۔ نادر علی اس گلی میں مُڑا تو تماشائیوں نے اس کو بتایا کہ کُتا اور کانسٹیبل کون سی گلی میں چلے گئے ہیں .... نادر علی کو دو اور گلیوں میں جانا پڑا۔ وہ مسلسل دوڑتے دوڑتے ہانپ گیا تھا۔

آخر وہ اُس گلی میں پہنچا جس کے ایک گھر کے بند دروازے پر کُتا اگلی ٹانگیں اٹھا اٹھا کر پنجے مار رہا تھا اور بڑی ہی بیتابی سے غرا اور بھونک رہا تھا۔

"یہ کس کا گھر ہے؟"— نادر علی نے کُتے تک پہنچنے سے پہلے پوچھا۔

"خواجہ صاحب کی حویلی کا پچھلا دروازہ ہے"— رحمان کے باپ نے جواب دیا— "لیکن آنے جانے کا اصل دروازہ اس گلی میں ہے"۔

"تم دوڑ کر اُدھر جاؤ"— نادر علی نے پاس کھڑے ہیڈ کانسٹیبل کو کہا— "اس حویلی کا ایک دروازہ ادھر ہے ....

"مجھ کو معلوم ہے"— ہیڈ کانسٹیبل نے کہا— "میں اس حویلی سے واقف ہوں"۔

"دوڑو"— نادر علی نے کہا— "ادھر سے گھر کا کوئی فرد باہر نہ نکلے .... اور یہ دروازہ کھلواؤ۔ کوئی شخص رکاوٹ پیدا کرے تو اُس کے دانتوں پر گھونسہ مار کر خود اندر چلے جاؤ اور یہ دروازہ کھول دو"۔

پورے پانچ منٹ نہیں گزرے ہوں گے کہ دروازہ کھلا۔ خواجہ باہر آیا اور کُتا اس کی ٹانگوں سے ٹکرا کر اندر چلا گیا۔

"یہ میرے دروازے پر کیا تماشہ لگا دیا ہے"— خواجہ نے بڑے غصے سے نادر علی کو کہا۔

نادر علی کچھ بھی نہ بولا۔ خواجہ کو اندر کی طرف دھکہ دے کر اندر چلا گیا۔ اس نے دونوں کانسٹیبلوں کو اور رحمان کے باپ کو اندر بلایا اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

"خان صاحب!"— خواجہ نے نادر علی خان کو کہا— "میری پوزیشن کا کچھ خیال کریں"۔

"یہ بات اس کُتے کو سمجھائیں خواجہ صاحب!"— نادر علی نے اس کو کہا— "میرے راستے سے ہٹ جائیں"۔

کُتے کا کارنامہ

یہ اس قصبے کے ایک بڑے آدمی کی بہت بڑی اور عالیشان حویلی تھی۔ اصل حویلی کا دروازہ دوسری گلی میں تھا۔ یہ حصہ اسی حویلی کا تھا جس میں کُتا داخل ہُوا تھا۔ یہ حصہ مویشیوں کے لئے بھی تھا اور عام لوگوں کے لئے بھی۔ اس حصّے میں ایک خاص کمرہ تھا جو مقفل رہتا تھا۔ یہ خواجہ کا خاص کمرہ تھا۔ جس کا میں نے پہلے ذکر کیا ہے۔ خاصا کھلا صحن تھا جس کے وسط میں دو درخت

تھے۔ درختوں کے درمیان کھُرلی بنی ہوئی تھی جو کم و بیش چھ فٹ لمبی اور تین فٹ چوڑی تھی۔

خواجہ صدائے احتجاج بلند کئے جا رہا تھا اور نادر علی اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دے رہا تھا۔ اس کی توجہ رحمان کے کُتے پر تھی جو ایک کھلے کمرے کے اندر بار بار جاتا تھا اور بڑی تیزی سے باہر آجاتا اور زمین کو سونگھتا اور غیر معمولی بے چینی اور بے تابی کا اظہار کرتا تھا۔

نادر علی اُس کمرے میں گیا جس میں کُتا بار بار جاتا تھا۔ وہ کمرہ کباڑخانہ سا بنا ہُوا تھا۔ باہر آکر دیکھا تو کُتا کھُرلی کے اندر چلا گیا' کھُرلی میں پنجے مارتا اور منہ سے عجیب عجیب آوازیں نکالتا تھا۔ نادر علی نے کھرلی میں دیکھا۔ اس میں تازہ گھاس اور تھوڑے سے ہرے پٹھے پڑے ہوئے تھے۔ کُتے نے گھاس اور پٹھوں کو ایک جگہ سے ہٹا دیا۔ اس کے نیچے تازہ لپائی تھی۔

نادر علی نے ایک خاص چیز نوٹ کی۔ حویلی کے اس حصے میں کوئی ایک بھی مویشی نہ تھا۔ نہ کسی مویشی کا کوئی نشان تھا۔ کھُرلی کے اِردگرد بھی کوئی ایسا نشان نظر نہیں آتا تھا جس سے یہ ظاہر ہوتا کہ یہاں کبھی مویشی رکھے گئے ہوں۔ نادر علی کو شک ہُوا کہ کھُرلی میں کچھ نہ کچھ ہے اور جو کچھ بھی ہے وہ کتے کی دلچسپی کی چیز ہے۔ اس نے کانسٹیبلوں کو کہا کہ کھُرلی کو خالی کر دو اور نیچے سے کھو دو۔ جس کمرے میں کباڑخانہ بنا ہوا تھا وہاں سے کدال مل گئی۔

کھُرلی سے پٹھے ہٹائے گئے۔ کُتا کھُرلی میں سے نکلتا ہی نہیں تھا۔ کانسٹیبلوں نے دیکھا کہ کھُرلی کی لپائی تازہ ہے اور کدال بڑی آسانی سے کھدائی کر رہی ہے۔ نادر علی نے رحمان کے باپ کو کہا کہ وہ کُتے کو پکڑ لے۔ باپ نے آگے بڑھ کر کُتے کو پٹے سے پکڑا لیکن کُتا اس کے قابو میں نہیں آرہا تھا۔ آخر ایک

رّسی کُتے کے پٹے میں ڈالی گئی۔ کُتے کی بیتابی کا یہ عالم تھا کہ اس نے اپنے ہی مالک کے ہاتھ کو کاٹ لیا۔

"خان صاحب لاش!"—— یہ ایک کانسٹیبل کی گھبرائی ہوئی آواز تھی۔

نادر علی اسی آواز کا منتظر تھا۔ کانسٹیبلوں نے کھدائی روک دی تھی۔ نادر علی تیزی سے آگے بڑھا اور کھُرلی میں دیکھا۔ رحمان کا چہرہ صاف نظر آرہا تھا۔ نادر علی نے اپنے ہاتھوں سے اس کے چہرے سے مٹی ہٹائی۔ اس کے کندھے بھی سامنے آگئے تھے۔ نادر علی نے رحمان کے باپ کو بلایا اور اشارہ کیا۔ باپ نے جب کھُرلی میں دیکھا تو اس کی اتنی زور سے دھاڑ نکلی کہ سننے والوں کے دل دہل گئے۔ کُتے نے چھلانگ لگائی اور کھُرلی میں جا پڑا اور اس نے مرے ہوئے رحمان کا منہ چاٹنا شروع کر دیا۔ نادر علی جیسے سخت دل تھانیدار کے بھی آنسو نکل آئے۔

نادر علی کو قانونِ شہادت کے مطابق کارروائی کرنی تھی۔ وہ باہر نکلا۔ گلی میں لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا تھا۔ نادر علی نے ان میں سے دو معزّز آدمی اپنے پاس بلوائے اور ان کو اندر لے گیا۔ ان دونوں کو اس نے لاش کی برآمدگی کے گواہ بنانا تھا۔

"خواجہ صاحب!"—— نادر علی نے خواجہ کو کہا—— "آپ کا کھیل ختم ہو چکا ہے۔ اب آپ اپنی صفائی میں جو کچھ بھی کہیں گے وہ آپ کے خلاف ہی جائے گا۔ آپ بڑے آرام سے کھُرلی کے پاس کھڑے ہو کر کہہ دیں کہ یہ میرے گھر کی کھُرلی ہے اور میں اس میں سے رحمان ولد فلاں کی لاش برآمد کروا رہا ہوں"۔

ظاہر ہے کہ خواجہ نے فوراً ہی ہتھیار نہیں ڈال دیئے تھے۔ اس نے تھوڑی سی حیل و حجت کی لیکن نادر علی ایسے ملزموں کو لگام ڈالنا جانتا تھا۔ خواجہ

نے آگے بڑھ کر دونوں گواہوں کے سامنے وہ الفاظ کہہ دیئے جو نادر علی نے اس کو کہے تھے۔

لاش کھُلی سے نکالی گئی اور ایک چارپائی پر ڈال دی گئی۔ رحمان کا باپ ایک بار تو غش کھا کر گر پڑا۔ کُتا لاش سے ہٹ ہی نہیں رہا تھا۔ نادر علی نے کسی کو کہا کہ وہ کُتے کو اس کے گھر لے جا کر باندھ دے۔

لاش کی برآمدگی کے جو کاغذات تیار کئے جاتے ہیں وہ نادر علی نے کئے۔ اس تحریر پر خواجہ کے' دونوں گواہوں کے اور رحمان کے باپ کے دستخط لئے۔ پھر اس نے اپنے ہیڈ کانسٹیبل اور دونوں کانسٹیبلوں کو کہا کہ پوری حویلی کی تلاشی لیں اس تلاشی میں وہ خود بھی شامل ہُوا۔

گھر میں ایک تو خواجہ کی نوجوان بیوی عائشہ تھی اور دو نوکر تھے۔ ان سب کو خواجہ سمیت نادر علی نے حراست میں لے لیا۔

حویلی کی تلاشی میں جو خاص چیزیں قبضے میں لی گئیں ان میں ایک بارہ بور دو نالی بندوق تھی اور اس کے کارتوس تھے۔ یہ لائسنس والی تھی۔ اس کے علاوہ ایک ایئرگن بھی برآمد ہوئی۔ یہ بالکل نئی تھی۔ ایئرگن کے لائسنس کی ضرورت نہیں ہوتی۔ دو خنجر اور قابلِ اعتراض حد تک دو لمبے چاقو اور ایک برچھی اور غالباً دو کلہاڑیاں برآمد ہوئیں۔ نادر علی نے ان اشیاء کی برآمدگی کی بھی تحریر لکھی اور گواہوں کے دستخط کروائے۔

نادر علی نے نمبردار کو بلایا۔ اس کو معلوم تھا کہ خواجہ نے تین غنڈے رکھے ہوئے ہیں جن میں سے ایک بڑا پکّا اور تجربہ کار جرائم پیشہ ہے۔ نادر علی نے نمبردار کے ساتھ ایک کانسٹیبل بھیجا اور کہا کہ ان تینوں کو تھانے پہنچایا جائے۔ اس نے نمبردار کو یہ بھی کہا کہ یہ تینوں یا ان میں سے کوئی بھی حاضر نہ کیا گیا تو میں تمہیں گرفتار کرلوں گا۔

ایک آدمی کو تھانے اس پیغام کے ساتھ بھیجا گیا کہ اے ایس آئی دو کانسٹیبلوں کے ساتھ یہاں آجائے۔ پھر نادر علی نے لاش کو پوسٹ مارٹم کے واسطے بھجوا دیا۔ اس نے خود لاش کا نظری معائنہ کیا تھا۔ سر کے پیچھے اور دائیں کان کے اوپر سے خون نکلا تھا لیکن خون زیادہ نہیں تھا۔ نادر علی سمجھ نہ سکا کہ یہ کیسے زخم ہیں۔ ایسے لگتا تھا جیسے یہاں باریک سُوئے مارے گئے ہوں۔

یہ قصبے کا معاملہ تھا۔ تھانہ قریب ہی تھا۔ اے ایس آئی دو کانسٹیبلوں کے ساتھ پہنچ گیا۔ نادر علی نے اس کو کہا کہ وہ حویلی کے دونوں دروازے مقفل کر کے ان پر لاکھ کی مہریں لگا دے اور ایک ایک کانسٹیبل دونوں دروازوں پر کھڑا کر کے خود تھانہ آجائے۔

عائشہ تھانے میں

نادر علی خواجہ' عائشہ اور اس کے نوکروں کو ساتھ لے کر تھانے چلا گیا۔

اس سے آگے بات سنانے سے پہلے میں آپ کو یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ کُتے نے جس طرح لاش برآمد کروائی تھی' یہ کوئی عجوبہ یا معجزہ نہیں تھا۔ جو لوگ کُتے اور گھوڑے کی نفسیات کو سمجھتے ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ دونوں جانور اپنے مالک کو اسی طرح زمین کے نیچے سے بھی نکال لیا کرتے ہیں۔

میری اپنی سروس کا ایک واقعہ ہے کہ ایک صاحبِ حیثیت آدمی اپنی گھوڑی پر سوار دیہاتی علاقے میں گیا۔ اس کی کسی خاندان کے ساتھ دشمنی تھی۔ ان لوگوں کو پتہ چل گیا کہ یہ شخص فلاں طرف جا رہا ہے۔ انہوں نے گھات لگائی اور اس کو روک کر قتل کر دیا۔ گھوڑی وہاں سے بھاگ اٹھی اور سیدھی گھر پہنچی۔ گھوڑی بڑی بے تابی سے ہنہناتی اور کھُر مارتی تھی۔ گھر والے نکلے تو گھوڑی واپس چل پڑی۔ گھر والے اس کے پیچھے پیچھے گئے اور گھوڑی ان کو

وہاں تک لے گئی جہاں اس کے مالک کو قتل کیا گیا تھا۔ وہاں خون تھا' لاش نہیں تھی جو بعد میں برآمد کرلی گئی۔

میں آپ کو ایسے کئی واقعات سنا سکتا ہوں۔ کُتا تو اس سے زیادہ وفادار اور دانش مند ہوتا ہے۔ میں نے ایسے واقعات بھی دیکھے ہیں کہ کُتے نے اپنے مالک کو ڈوبنے سے بچا لیا۔ کسی کا گھوڑا یا کتا چوری ہو جائے اور اُسے کتنی ہی دُور لے جائیں' اگر اسے وہاں سے نکلنے کا موقع مل جائے تو گھوڑا ہو یا کُتا' اپنے گھر پہنچ جاتا ہے۔ محترم صابر حسین راجپوت کی کہانیوں میں آپ نے کُتوں کے ایسے واقعات پڑھے ہوں گے۔

تھانے جا کر نادر علی نے خواجہ کے ساتھ بات کرنے کی بجائے عائشہ کو الگ کر کے اپنے پاس بٹھا لیا اور اس کو کہا کہ وہ جو کچھ جانتی ہے بتا دے۔ عائشہ نوجوان لڑکی تھی اور پولیس کے چکر میں پہلی بار آئی تھی۔ اُس نے رونا شروع کردیا۔

"تمہارے آنسو مجھ کو اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتے"—نادر علی نے کہا—"ابھی تو تمہارے آنسو نکلے ہیں۔ تم سچ نہیں بولو گی تو کچھ دیر بعد تمہیں رونے کی بھی ہوش نہیں رہے گی۔ میں تمہیں ایک مشورہ دیتا ہوں۔ اس پر عمل کرو اور اپنی اس جوانی کو بچاؤ۔ یہ امیر کبیر لوگ کسی کے وفادار نہیں ہوتے۔ تم دولت کے لالچ میں اس کی بیوی بن گئی تھی۔ اب تم دیکھنا کہ یہ سارا جرم تمہارے منہ پر تھوپ دے گا"۔

"خدا کی قسم!"—عائشہ نے روتے ہوئے کہا—"میں اتنا ہی جانتی ہوں کہ کل رات میری آنکھ کُھلی تو اس طرف سے ایسی آوازیں آ رہی تھیں جیسے کھدائی ہو رہی ہو یا کوئی لکڑیاں چِیر رہا ہو۔ میں اس طرف جانے لگی تو درمیان والا دروازہ بند تھا۔ دروازے کی درز میں سے دیکھا تین آدمی کُھرلی میں کھدائی

کر رہے تھے۔ خواجہ الگ کھڑا تھا۔ کُتا بھونک رہا تھا۔ چاندنی میں مجھ کو اچھی طرح نظر آ رہا تھا۔ پھر یہ تینوں آدمی ایک کمرے میں گئے اور جب باہر تو انہوں نے ایک آدمی کو اٹھایا ہُوا تھا۔ اس کو انہوں کُھرلی میں لٹا دیا۔ خواجہ نے کہا کہ مٹی ڈال کر اوپر لپائی کردو اور اوپر گھاس اور پٹھے ڈال دو۔ میرا خیال ہے کہ یہ لوگ گھاس اور پٹھے پہلے ہی لے آئے تھے۔ کُتا بار بار کُھرلی میں جاتا تھا۔ خواجہ نے کُتے کو پکڑا اور باہر والا دروازہ کھول کر اس کو باہر نکال دیا اور دروازہ بند کر لیا"۔

"کیا تم نے خواجہ سے پوچھا تھا کہ اِدھر کیا ہو رہا؟"—نادر علی نے پوچھا۔

"نہیں"—عائشہ نے جواب دیا—"اگر یہ بات مجھ کو بتانے والی ہوتی تو خواجہ ضرور بتا دیتا۔ میں نے ڈر کے مارے نہیں پوچھا"۔

"کیا تم ان تینوں آدمیوں کو پہچانتی ہو؟"—نادر علی نے پوچھا۔

"ہاں جی!"—عائشہ نے جواب دیا—"یہ تینوں خواجہ کے خاص آدمی ہیں"۔

اس نے تینوں کے نام بتا دیئے۔

نادر علی نے عائشہ کو الگ بھیج دیا اور خواجہ کے ایک نوکر کو بلا لیا اور اس کو کہا کہ وہ ان بڑے لوگوں کے چکر سے نکلے اور اپنی جان بچائے۔ یہاں میں ضروری نہیں سمجھتا کہ وہ تمام مکالمے لکھوں جو نادر علی اور اس نوکر کے درمیان ہوئے تھے۔ یہ ادھیڑ عمر نوکر تھا۔ کچھ عقل والا بھی لگتا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ خواجہ کے بچنے کی کوئی صورت نہیں اور کوئی ایک بھی بات شک میں نہیں۔ نادر علی نے اس کو بڑے پیار اور شفقت سے سمجھا دیا تھا کہ وہ سب کچھ بتا دے گا تو اس کو بچانے کی پوری کوشش کی جائے گی۔ نوکر نے فوراً" ہی بولنے پر رضامندی کا اظہار کردیا۔

اگر میں پوری طرح یہ بیان کرنے لگوں کہ نادر علی نے کس کس کے ساتھ کیا کیا باتیں کیں اور اس کو اقبالی بیان پر کس طرح تیار کیا تو یہ بات سینکڑوں صفحوں پر پھیل جائے گی۔ یہ پولیس کے طریقے ہوتے ہیں۔ مختلف مُشتبہوں اور ملزموں کے ساتھ مختلف برتاؤ اور رویّہ اختیار کیا جاتا ہے۔ نادر علی اس معاملے میں تجربہ بھی رکھتا تھا اور اس کو خدا نے غیر معمولی تفتیشی عقل بھی عطا کی تھی۔

اس نوکر سے ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ پہلے خواجہ کے پاس صرف دو نالی بندوق تھی' ائیرگن نہیں تھی۔ اس واردات سے دو دن پہلے خواجہ راولپنڈی گیا تھا اور وہاں سے نئی ائیرگن خرید کر لایا تھا۔ اس شخص نے دوسری اہم بات یہ بتائی کہ واردات والی رات خواجہ نے اس کو کہا تھا کہ رحمان کُتا لے کر باہر گیا ہُوا ہے۔ تم گلی میں کھڑے رہو۔ وہ جب ادھر سے گزرے تو اس کو کہنا کہ خوجہ صاحب پچھلے دروازے کے باہر کھڑے ہیں اور اس کے ساتھ کوئی ضروری بات کرنا چاہتے ہیں۔

نوکر کو رحمان واپس آتا نظر آگیا۔ نوکر نے اس کو آواز دے کر روک لیا اور خواجہ کا پیغام دیا۔ رحمان نے پوچھا کہ بات کیا ہے۔ نوکر نے کہا کہ وہ باہر کھڑے ہیں' وہیں کھڑے کھڑے کوئی بات کریں گے۔ رحمان میں ذرا سی بھی عقل ہوتی تو وہ نہ جاتا۔ اس کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اس نے خواجہ کے بیٹے کو قتل کیا ہُوا ہے اور خواجہ کوئی انتقامی کارروائی کر سکتا ہے لیکن جب زندگی کے دن پورے ہو جاتے ہیں تو انسان کی عقل پر پردے پڑ جاتے ہیں۔ رحمان غالباً' جوانی کے نشے میں اور اس دلیری سے چلا گیا ہو گا کہ بوڑھا خواجہ اس کا کیا بگاڑ لے گا۔

نوکر نے بتایا کہ جب رحمان خوجہ کے پاس پہنچا تو خواجہ نے اس کو گلے لگا

لیا اور کہا کہ وہ رحمان کو اپنے بیٹے جیسا سمجھتا ہے اور اس کے ساتھ راضی نامہ کرنا چاہتا ہے۔ خواجہ نے یہ بات روتے ہوئے کہی تھی۔ رحمان کے دن پورے ہو چکے تھے۔ وہ خواجہ کے بلکہ موت کے جال میں آگیا اور خواجہ کے ساتھ اندر چلا گیا۔ خواجہ نے نوکر کو کہا کہ وہ چلا جائے۔ نوکر باہر سے ہی حویلی کی دوسری طرف چلا گیا۔

نوکر کو یہ بھی معلوم تھا کہ خواجہ کے تینوں بدمعاش حویلی کے اس حصے میں موجود تھے جہاں رحمان کو قتل کیا گیا تھا۔

اس نوکر کے بعد نادر علی نے خواجہ کو اپنے پاس بٹھایا اور اس کو کہا کہ وہ خود ہی اقبالی بیان دے دے۔ خواجہ اپنے آپ کو بہت بڑا آدمی سمجھتا تھا۔ وہ انگریزوں کا پٹھو تھا اور اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ وہ قانون کی گرفت سے نکل آئے گا اور انگریز اس کا لحاظ کریں گے۔ اُسی نشے میں اس نے نادر علی کے ساتھ خاصی بدتمیزی سے بات کی۔

نادر علی نے اس کو بڑے احترام سے سمجھانے کی کوشش کی۔

"دیکھ اوئے تھانیدار بھائی!"—— خواجہ نے طنزیہ سے لہجے میں کہا—— "منہ سے بول' کتنی رقم چاہتا ہے اور معاملہ یہیں ٹھپ کر دے۔ اگر یہ منظور نہیں تو یہ دل سے نکال دے کہ میں اقبالی بیان دوں گا۔ خدا نے مجھ کو بہت دیا ہے۔ میں لاہور سے وکیل بلواؤں گا اور مقدمہ لڑوں گا۔ بات بالکل صاف ہے کہ میرے بیٹے کے دو قاتل تھے۔ ایک معلوم نہیں کس کے ہاتھوں قتل ہو گیا ہے اور دوسرے کو میں نے قتل کیا ہے"۔

"واہ خواجہ صاحب!"—— نادر علی نے کہا—— "میں آپ کو اقبالی بیان کے واسطے نہیں کہوں گا اور یہ سن لے خواجہ! میں تجھے پھانسی کی سزا نہیں ہونے دوں گا' عمر قید دلواؤں گا تاکہ اس عمر میں تم جیل میں تڑپ تڑپ کر اور ترس

ترس کر مرو۔ تمہاری باقی عمر جیل میں پوری ہو گی"۔

نادر علی اس شخص سے بے شمار رشوت لے سکتا تھا لیکن اس نے ایک پیسہ نہ لیا۔ رشوت لینے والے اس قسم کے آدمیوں سے زیادہ رشوت لے لیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو معلوم ہوتا ہے کہ اس جال میں سے تو اس نے نکلنا ہی نہیں ہے لیکن ان کو نکلنے کا جھانسہ دے دیا جاتا ہے۔ نادر علی اس قسم کے پولیس افسروں میں سے نہیں تھا۔ ایک تو وہ دیانتدار آدمی تھی اور دوسرے خواجہ نے اس کو چیلنج کر دیا تھا اس وجہ سے نادر علی پہلے سے زیادہ تیز ہو گیا۔

عائشہ' عائل اور عصمت

نمبردار اور کانسٹیبل خواجہ کے تینوں آدمیوں کو لے آئے۔ نادر علی نے تینوں کو اپنے پاس بلایا اور ان کو کہا کہ وہ اب کہیں نہیں جا سکیں گے' اب وہ اپنے آپ کو گرفتار سمجھیں۔

"میں تم تینوں کو ایک موقع دیتا ہوں"— نادر علی نے کہا— "تمہیں الگ الگ بٹھا دوں گا' تھوڑی دیر بعد اکیلے اکیلے کو بلوا کر پوچھوں گا۔ تم میں سے جو پورا اقبالی بیان دے گا' اس کو وعدہ معاف گواہ بنا دوں گا۔ میں تمہیں ابھی بتا دیتا ہوں کہ شہادت اور ثبوت اتنے مضبوط ہیں کہ سیشن میں جا کر اقبالی بیان سے منحرف ہو جاؤ گے تو بھی سزا سے نہیں بچ سکو گے"۔

اس نے ایک ہیڈ کانسٹیبل کو بلا کر کہا کہ ان تینوں کو الگ الگ حراست میں رکھو اور ان میں سے جو بھی میرے پاس اقبالی بیان دینے کے لئے آئے اس کو لے آؤ۔

ہیڈ کانسٹیبل ان کو لے گیا۔

دس منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ ہیڈ کانسٹیبل اُس آدمی کو لے کر آگیا جو پکا جرائم پیشہ اور ایک دفعہ کا سزا یافتہ بھی تھا۔ اُس کی عمر تقریباً" 35 سال تھی اور اچھا خوبرو آدمی تھا۔ بات بڑے اچھے طریقے سے کرتا تھا۔ کوئی اجنبی اس کو دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ شخص عادی مجرم ہے۔ ہیڈ کانسٹیبل نے نادر علی کو بتایا کہ یہ شخص بیان دینا چاہتا ہے۔ نادر علی نے اس کو اپنے پاس بٹھا لیا اور ہیڈ کانسٹیبل کو بھیج دیا۔

"خان صاحب!"— اُس شخص نے جس کا مشہور نام آچھی تھا کہا— "یہ آپ کی مرضی ہے کہ جس کو چاہیں وعدہ معاف گواہ بنائیں لیکن آپ مہربانی کرنے پر آہی گئے ہیں تو میں تم کو بتاتا ہوں کہ صرف میں وعدہ معاف گواہ بننے کا حق رکھتا ہوں"۔

"تم کیوں حق رکھتے ہو؟"

"خان صاحب!"— آچھی نے جواب دیا— "قتل ایک کرو یا دس بندے مار ڈالو' پھانسی تو ایک ہی بار ہوتی ہے۔ میرے یہ دونوں ساتھی اقبالی بیان دیں گے تو وہ ایک شخص کے قتل کا بیان ہو گا۔ میں دو آدمیوں کے قتل کا اقبال کروں گا۔ بس میری عرض یہ ہے کہ آپ اپنا وعدہ پورا کریں اور مجھ کو وعدہ معاف گواہ ضرور بنائیں"۔

"دوسرا کون؟"

"سلیم!"— آچھی نے جواب دیا— "وہ جس کی لاش نالے سے برآمد ہوئی ہے اور رحمان کی بہن بھی جس کے ساتھ تھی"۔

نادر علی کو ایسا جھٹکا محسوس ہُوا کہ جیسے کسی نے اس کے جسم کے ساتھ بجلی کے ننگے تار لگا دیئے ہوں۔ کچھ دیر تک تو وہ بول ہی نہ سکا۔

"خان صاحب!"— آچھی نے کہا— "یہ ایسی واردات ہے جس کے ملزموں کو آپ نہیں پکڑ سکتے تھے۔ میں آپ کی یہ تفتیش بھی پوری کر دیتا ہوں"۔

"لا ہاتھ آچھی!"— نادر علی نے اپنا دایاں ہاتھ اُس کی طرف بڑھا کر کہا — "تو میرا وعدہ معاف گواہ ہے۔ اب بیان ہو جائے"۔

نادر علی نے مجھ کو آچھی کا جو بیان سنایا تھا وہ میں ذرا مختصر کر کے سنا دیتا ہوں۔ میں نے پہلے کہا ہے کہ مجھ کو معلوم تھا کہ خواجہ اپنے بیٹے کا خون معاف نہیں کرے گا اور وہ انتقام لے گا۔ آچھی نے بیان میں کہا کہ جب سلیم اور رحمان ہائی کورٹ سے اپیل میں بری ہو گئے تو خواجہ نے اپنے ان تینوں آدمیوں کو بلا کر کہا کہ وہ اپنے بیٹے کے ان دونوں قاتلوں کو زندہ چلتا پھرتا نہیں دیکھ سکتا۔ اس نے ان آدمیوں کو کہا کہ ان کو ختم کرنے کی ترکیب کرو اور مجھ سے منہ مانگا انعام لو۔ انہوں نے قتل کے طریقے سوچنے شروع کر دیئے۔ مسئلہ یہ تھا کہ قتل ایسے طریقے سے کیا جائے کہ سراغ نہ ملے۔ خواجہ بھی یہی کہتا تھا کہ وقت زیادہ لگ جائے تو کوئی بات نہیں، کوشش یہ ہونی چاہئے کہ پکڑے نہ جائیں اور اگر پکڑے جائیں تو پولیس کو شہادت نہ ملے۔

ایک روز آچھی کو فتح شاہ نے اپنے گھر بلایا اور اس کو بتایا کہ خواجہ کی نوجوان بیوی عائشہ اس کے پاس آتی ہے اور اس کا مطالبہ ہے کہ میں کوئی ایسا عمل کروں جس سے خواجہ اس کو طلاق نہ دے۔ دراصل بیٹے کے قتل کے بعد خواجہ نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ وہ عائشہ کو طلاق دے دے گا۔ اس کو احساس ہو گیا تھا کہ اس کے دل میں اپنے بیٹے کی دشمنی عائشہ نے ہی پیدا کی تھی۔ عائشہ کو خواجہ کے ارادے کا پتہ لگا تو وہ فتح شاہ کو بہت بڑا عامل سمجھ کر اس کے پاس رات کے وقت چوری چھپے گئی اور اپنا یہ مسئلہ پیش کیا۔

فتح شاہ نے اس کو یقین کے ساتھ کہا کہ وہ ایسا عمل کرے گا کہ خواجہ اس کا غلام ہو جائے گا۔ فتح شاہ استاد آدمی تھا۔ فراڈیئے عاملوں کی طرح چکنی چُپڑی باتیں کرنے کی مہارت رکھتا تھا۔ اس کے سامنے عائشہ کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتی تھی۔

"شاہ جی!"— عائشہ نے اس کو کہا— "ایک کام اور ہے۔ آپ یہ کام کر دیں اور بتائیں کہ کتنی رقم چاہئے، میں فوراً دوں گی"۔

"کام بتاؤ"۔

"آپ کو پتہ ہو گا کہ خواجہ کا بیٹا بشیر قتل ہو گیا تھا"— عائشہ نے کہا— "آپ کو یہ پتہ نہیں کہ میرے دل میں بشیر کی کتنی محبت تھی۔ اس کا قاتل سلیم تھا۔ وہ اپیل میں بری ہو کر آگیا ہے۔ میں اس سے اپنے محبوب کے خون کا بدلہ لینا چاہتی ہوں، لیکن میں عورت ذات یہ کام نہیں کر سکتی۔ کیا آپ کے ہاتھ میں ایسی طاقت ہے کہ سلیم میرے سامنے چلتے چلتے گرے اور مر جائے؟"

"ہاں بی بی!"— فتح شاہ نے کہا— "میرے ہاتھ یہ طاقت ہے لیکن اس میں مجھ کو اپنی جان کا خطرہ ہے۔ اپنی جان کی حفاظت کے واسطے ایسا انتظام کرنا پڑتا ہے جس میں بے شمار رقم خرچ ہو جاتی ہے، مثلاً کوئی ہندو مر جائے تو اس کے جسم کی راکھ کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ راکھ ہندوؤں کے مُردے جلانے والوں سے مل جاتی ہے لیکن وہ ایک چٹکی بھر راکھ کا ایک ہزار روپیہ لے لیتے ہیں۔ پھر چیل کے گھونسلے کی ایک خاص لکڑی کی ضرورت ہوتی ہے اس لکڑی کو پہچاننے والے خاص آدمی ہوتے ہیں۔ چھوٹی سی ایک لکڑی لانے کے واسطے وہ سینکڑوں روپیہ لے لیتے ہیں۔ پھر اس کام کے واسطے خنزیر کے تھوڑے سے گوبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ میں لاہور سے لا سکتا ہوں۔ اس پر بھی رقم خرچ ہو گی"۔

"شاہ جی!" — عائشہ نے کہا — "مجھ کو یہ چیزیں کیوں بتاتے ہیں۔ مجھ کو آپ پر اعتبار ہے۔ آپ یہ بتائیں کہ میں آپ کو کتنی رقم دوں"۔

فتح شاہ نے کچھ دیر اوٹ پٹانگ حساب کر کے کہا کہ بارہ ہزار دے دے۔

آخر سودا دس ہزار پر طے ہو گیا' اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی طے ہُوا کہ یہ رقم اُس وقت ادا ہو گی جب سلیم مارا جائے گا۔

ایک بات یہ ذہن میں رکھیں کہ یہ دس ہزار روپیہ آج والا نہیں تھا۔ اُس زمانے کا دس ہزار آج کے پانچ لاکھ کے برابر تھا۔ دوسری بات یہ ذہن میں رکھ لیں کہ فتح شاہ کے ہاتھ میں کوئی ایسی طاقت نہیں تھی کہ وہ کسی چلتے پھرتے شخص کی جان اپنے علم کے زور پر لے لیتا۔ اس کی خوش قسمتی سمجھیں اور سلیم کی بدقسمتی سمجھیں کہ اُن ہی دنوں سلیم اپیل میں بری ہو کر گھر آگیا تو اس کی منگنی جو سکینہ کے ساتھ ہو چکی تھی وہ سکینہ کے والدین نے توڑ ڈالی۔

سلیم سکینہ کو نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ وہ سکینہ کو دلی طور پر چاہتا تھا اور سکینہ اس کو چاہتی تھی۔ سکینہ نے یہ بات اپنے بیان میں نادر علی کو بتائی تھی۔ سکینہ کی محبت کی خاطر ہی سلیم نے خواجہ کے بیٹے بشیر کو قتل کیا تھا۔ اس قتل کی وجہ یہ تھی کہ بشیر نے سکینہ کے بھائی کو ڈبو کر مار ڈالا تھا۔ اب یہ منگنی ٹوٹ گئی تو سلیم اتنا زیادہ پریشان ہُوا کہ وہ فتح شاہ کے پاس گیا اور اپنی مراد اس کے آگے رکھی۔

فتح شاہ ایسے ہی بیوقوف سائلوں کے انتظار میں رہتا تھا۔ اُس نے سلیم کو اپنے جال میں لے لیا اور اس سے چند سو روپے لے کر پہلے تو اُوٹ پٹانگ عمل بتاتا رہا۔ اُس کا ارادہ یہ تھا کہ آگے چل کر اس سے کچھ اور رقم بٹورے گا۔

اتنے میں عائشہ نے آکر اپنا مسئلہ پیش کر دیا جس کے ساتھ دس ہزار روپیہ طے ہو گیا۔ فتح شاہ دراصل جرائم پیشہ آدمی تھا اور وہ کوئی معمولی جرم نہیں کرتا تھا۔

اُس نے اُسی رات آچھی کو بلایا۔ آچھی اس کا بڑا گہرا یار تھا۔ اُس نے آچھی کو بتایا کہ دس ہزار روپیہ ہاتھ آتا ہے اور لڑکی بھی بڑی خوبصورت ہے۔ اس نے بتایا کہ سلیم کو ختم کرنا ہے' اس نے یہ بھی بتایا کہ کسی کو ختم کرنے کے واسطے اس کے پاس کوئی علم اور عمل نہیں .... آچھی دراصل خواجہ کا آدمی تھا۔ اس نے فتح شاہ کو کہا کہ کوئی ایسا چکر چلاؤ کہ سلیم کسی عمل کے سلسلے میں رات کہیں ویرانے میں چلا جائے۔

فتح شاہ کے واسطے ایسی پلاننگ کوئی مشکل نہ تھی۔ اُس نے فوراً" ایک عمل سوچ لیا جو اس نے آچھی کو بھی بتایا۔ انہوں نے ایک رات مقرر کر لی۔ آچھی نے ایک اور ساتھی کی ضرورت محسوس کی۔ فتح شاہ نے کہا کہ وہ خود اس کا ساتھ دے گا۔

آچھی کا کھلا آنا جانا خواجہ کے گھر میں تھا۔ خواجہ کی غیر حاضری میں عائشہ گھر میں اکیلی ہوتی تھی۔ آچھی نے عائشہ کو کہا کہ وہ اس کا کام کر دے گا بلکہ اس کا دوسرا کام بھی کر دے گا کہ خواجہ اس کو طلاق نہیں دے گا۔ عائشہ نے اس کو کہا کہ خواجہ کو پتہ نہیں لگنا چاہئے کہ وہ یہ دونوں کام کروا رہی ہے۔ آچھی نے عائشہ سے جو اُجرت وصول کی وہ اس کا حسین جسم تھا۔ عائشہ نے اپنا آپ اس کے حوالے کر دیا۔

عینی شاہد بے زبان تھا

پلاننگ کے مطابق فتح شاہ بازار سے گتّے کے دو ماسک لے آیا۔ دو کالی چادروں کا اس نے انتظام کر لیا۔ انہوں نے جو حُلیہ بنانا تھا اس کے سارے لوازمات پورے کر لئے اور سلیم کو وہ چیزیں دے دیں جو اس کی لاش کے قریب سے برآمد ہوئی تھیں۔ اس کو تو ظاہر ہے کہ یہ بتایا گیا تھا کہ یہ کالے عمل کی چیزیں ہیں لیکن ان چیزوں کا اصل مقصد یہ تھا کہ جب یہ لاش کے قریب سے

برآمد ہوں گی تو یہ کہا جائے گا کہ یہ کوئی کالا عمل کر رہا تھا جس کا اثر اُلٹا ہو گیا ہے۔"
آخر سلیم کو موت اپنے پھندے میں لے گئی۔ فتح شاہ نے اس کو یہ اشیاء
دے کر کہا کہ نالے میں جہاں پانی دو حصّوں میں تقسیم ہوتا ہے وہاں کھڑے ہو
کر یہ عمل اس طرح کرنا ہے۔ اس نے سلیم کو یہ اجازت بھی دے دی کہ وہ
سکینہ کو بھی ساتھ لے جائے۔ اس سے یہ عمل جلدی اثر کرے گا۔

سلیم سکینہ کو لے کر چلا گیا۔ آچھی اور فتح شاہ کنارے کے اندر چھپے ہوئے
تھے۔ انہوں نے ماسک چڑھا لئے تھے اور اوپر کالی چادریں لے لی تھیں۔ تصوّر
میں لائیں تو پتہ لگتا ہے کہ کوئی پُراسرار مخلوق تھے۔ انہوں نے جس طرح سلیم
کو قتل کیا وہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔

آچھی نے اگلی صبح عائشہ کو یہ خوش خبری سنائی اور کہا کہ وہ دس ہزار روپیہ
فتح شاہ کو دے دے۔ اس دس ہزار میں آدھا حصہ آچھی کا تھا لیکن ہُوا یہ کہ
اگلے روز فتح شاہ کو تھانے بلا لیا گیا۔ آچھی کی زبانی معلوم ہُوا کہ جو ماسک فتح شاہ
کے لڑکے نے چہرے پر چڑھایا ہُوا تھا یہ رات کو فتح شاہ نے اپنے چہرے پر چڑھایا تھا۔

یہ تو سلیم کے قتل کی کہانی ہے۔ خواجہ بہت ہی خوش تھا کہ اس کے بیٹے کا
ایک قاتل خود ہی قتل ہو گیا ہے۔ اس نے آچھی کو کہا کہ اب رحمان کو اپنے
ہاتھوں قتل کرے گا۔ آچھی نے اپنے بیان میں کہا کہ خواجہ ایک ہی بات کہتا تھا
کہ جس طرح اس کے بیٹے کے سر میں ائیرگن کے چھرّے اتارے گئے تھے،
اسی طرح وہ رحمان کے دماغ میں چھرّے اُتارے گا۔ اسی روز وہ راولپنڈی
گیا اور ایک ائیرگن خرید کر لے آیا۔

آخر انہوں نے قتل کی رات طے کر لی۔ اُس رات آچھی اور اُس کے
دونوں ساتھی خواجہ کے ساتھ حویلی کے دوسرے حصے میں موجود رہے اور اس
کے خاص کمرے میں بیٹھ کر انہوں نے شراب پی۔ رحمان کو جس طرح اس

پھندے میں لایا گیا وہ بیان ہو چکا ہے۔ اندر لے جا کر خواجہ اس کو اپنے خاص
کمرے میں لے گیا۔ رحمان کا کُتا اس کے ساتھ تھا۔

اُس زمانے میں لوگ جلدی سو جایا کرتے تھے۔ انہوں نے رحمان کو بٹھائے
رکھا۔ آچھی نے بتایا کہ رحمان کو شاید کچھ شک ہو گیا تھا۔ یہ اس طرح محسوس
ہُوا کہ وہ بے چین سا ہو گیا اور کہنے لگا کہ وہ گھر جانا چاہتا ہے۔ خواجہ نے کہا کہ
اس کو اس کے گھر پہنچا دو۔ تینوں آدمی اُٹھے اور رحمان کو اس کمرے میں لے
گئے جو کباڑخانہ بنا ہُوا تھا تب رحمان کو پتہ لگا کہ وہ ایک جال میں آگیا ہے۔ اُس
نے مزاحمت کی لیکن تین آدمیوں میں وہ کیا کر سکتا تھا۔ تینوں نے اس کو جکڑ
لیا۔ اتنے میں خواجہ ائیرگن لے کر آگیا۔ اُس نے گن کی نالی رحمان کے سر کے
پیچھے لگا کر ایک چھرّہ چلایا۔ رحمان کو چھوڑ دیا گیا۔ وہ گرا تو خواجہ نے گن میں
دوسرا چھرّہ ڈال کر نالی رحمان کے کان سے ذرا اوپر سر پر رکھی اور چھرّہ چلا دیا۔

رحمان کچھ دیر تڑپتا رہا۔ اس کی جان نکلتے نکلتے تقریباً" آدھا گھنٹہ گزر گیا۔
اس دوران کُتا بڑی ہی بے چینی سے رحمان کے اِردگرد پھرتا رہا۔ ان قاتلوں
کے دماغوں کو ایسا خون چڑھا کہ دماغ میں صرف یہی بات رہ گئی کہ لاش کو
ٹھکانے لگانا ہے۔ کتے کی طرف ان کا دھیان نہ گیا۔ انہوں نے انتظام پورا کیا
ہُوا تھا۔ کھرلی میں کھدائی کر کے لاش اس میں رکھ دی گئی۔ کُتا کُود کر کھُرلی میں
آگیا۔ اُس وقت خواجہ کو خیال آیا کہ کُتا اپنے مالک کے پیچھے آرہا ہے۔ اس نے
کُتے کو گھسیٹ کر باہر نکال دیا۔ تھوڑی سی کھدائی کر کے لاش کو اس میں دبا دیا
گیا۔ اوپر مٹی ڈال کر لپائی کر دی گئی۔ گھاس اور پٹھوں کا انتظام پہلے ہی کر لیا گیا
تھا۔ یہ کھرلی میں بکھیر دیئے گئے اور یہ لوگ مطمئن ہو گئے کہ اب اس قتل کا
سراغ مل ہی نہیں سکے گا لیکن خدا کی نظروں سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں ہوتا۔
نادر علی جیسا صاحب ایمان تھانیدار موجود تھا۔ اُس نے جس طرح ملزموں کو

پکڑا وہ میں نے سنا دیا ہے۔

پوسٹمارٹم رپورٹ آگئی تھی۔ نادر علی نے مجھ کو یہ رپورٹ سنائی تو ایسا لگا جیسے میں خواجہ کے بیٹے بشیر کی پوسٹمارٹم رپورٹ سُن رہا ہوں۔ رحمان کی کھوپڑی میں ایک باریک سوراخ پیچھے تھا اور ایک دائیں کان کے ذرا اوپر تھا۔ دماغ میں ائیرگن کے دو چھرّے اُترے ہوئے تھے۔ خواجہ نے سوفیصد صحیح انتقام لیا تھا۔

اس کے بعد نادر علی نے ہر ملزم کو یہ جھانسہ دیا کہ وہ اس کو وعدہ معاف گواہ بنائے گا۔ اس نے ہر ایک سے اقبالی بیان لے لئے سوائے خواجہ کے۔ عائشہ نے بھی بیان دے دیا۔

مقدمہ تیار کرنے میں انگریزی ایس پی نے نادر علی کی بہت مدد کی۔ اس کو تعریفی سند دینے کے علاوہ ایک ہزار روپیہ انعام بھی دلوایا۔ آچھی کو وعدہ معاف گواہ بنایا گیا تھا۔ مقدمہ کورٹ میں گیا تو خواجہ نے جیسے کہا تھا ویسے ہی لاہور سے ایک ہندو وکیل کو بلایا لیکن یہ وکیل بھی اُس کو سزا سے بچا نہ سکا۔ رحمان کے قتل میں اس کو عمر قید کی سزا دی گئی۔ سلیم کے قتل میں فتح شاہ کو سزائے موت دی گئی۔ رحمان کے قتل میں آچھی کے دونوں دوستوں کو دس دس سال سزا ہوئی۔ آچھی چونکہ وعدہ معاف گواہ تھا اس واسطے اس کو چھوڑ دیا گیا تھا اور عائشہ کو اس بناء پر چھوڑ دیا گیا تھا کہ وہ عملی طور پر کسی جرم میں شامل نہیں تھی۔ یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا تھا کہ اس نے فتح شاہ کو کہا تھا کہ سلیم کو قتل کر دو تو میں دس ہزار روپیہ دوں گی۔

جب پاکستان معرضِ وجود میں آیا اُس وقت خواجہ اپنی سزا کا ایک پورا کر چکا تھا لیکن اُس کی صحت بڑی تیزی سے جواب دے رہی تھی۔ چند مہینے اور گزرے تو وہ ایسا بیمار پڑا کہ جیل کے ہسپتال میں مرگیا۔

○○○